भारतीय डाक
India Post

MPKT GALLERIA <122009>
A RH154758247IN
Counter No:1,OP-Code:DH
Amount:Rs20.00
Wt:250grams,21/10/2013 12:39

To:Srinagar G.P.O.<190001>

افسانہ نگار کی طرف سے
بطور عطیہ
احترام کے ساتھ

To Shri Manzoor Ahmad Dolkar
Brari Nishat Colony
SRINAGAR 191121

21/10/13

26-10-2013

From:
Kishori Lal
F-72 Ridgewood Estate
DLF City Phase IV
Gurgaon – 122002
Phone: 9910071114

میں نے پینا چھوڑ دیا

اور

دیگر مزاحیہ افسانے

کشوری لال

مصنف کی دیگر اُردو تصانیف

- حبابِ سخن (شاعری)
- وادیِ سخن (شاعری)
- مصالحوں کے رنگ (افسانے)
- بیرنگ لفافہ (افسانے)
- وہ کہاں سے آیا (افسانے)

MODERN PUBLISHING HOUSE
9, Gola Market, Darya Ganj, New Delhi-110002
Phone: 011-23278869, Mobile : 9312566664
Email: vijaybooks@yahoo.com

Mai Ne Peena Chhor Dia Aur Digar Mazahiya Afsane **2013**
by : KISHORI LAL **₹150/-**

میں نے پینا چھوڑ دیا
اور
دیگر مزاحیہ افسانے

کشوری لال

موڈرن پبلشنگ ہاؤس
۹- گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲

F-72, Ridgewood Estate,
DLF Phase-IV, Gurgaon-122002
فون : 0124-4101972
موبائل : 09910071114

سنِ اشاعت : 2013
قیمت : ایک سو پچاس روپے
کمپوزنگ : نعمت کمپوزنگ ہاؤس، دہلی
سرورق : انعم آرٹس، دہلی
مطبع : ایچ۔ایس۔آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی-2

ISBN 978-81-8042-281-2

زیرِ اہتمام
پریم گوپال متّل

ناشر:
موڈرن پبلشنگ ہاؤس ۹-گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲

فہرست

سرکاری شفاخانہ

اقوامِ متحدہ کے ایک ادارہ کے ٹبلیٹن میں یہ خبر چھپی تھی کہ جو رقم ادارہ قدرتی آفتوں جیسے زلزلہ، سمندری طوفان، سیلاب وغیرہ اور مہلک یا وبائی بیماریوں کے گھیرے میں آئے مصیبت زدہ لوگوں کے لیے مقرر کرتا ہے اُس کا مشکل سے دس فیصد حصہ ضرورت مندوں تک پہنچ پاتا ہے۔ باقی رقم شاہی نیتہ، ادارہ کے اہل کار اور عملہ، رشوت خوروں، تاجروں اور تقسیم کاروں میں بٹ جاتا ہے جس کا کوئی حساب کتاب نہیں ہوتا۔ ایسے ہی کچھ حد تک سرکاری شفاخانوں کے لیے بجٹ میں مخصوص کیا ہوا زر عام مریض تک پہنچتے پہنچتے سکڑ جاتا ہے۔ وجوہات کوئی مختلف نہیں۔ وہی فیتہ شاہی، گھوس خوری اور چوری۔

شفاخانے کی عمارت عموماً پھٹے پرانے کپڑے کی طرح بوسیدہ حالت میں ہوتی ہے اور اس کی دیواریں ایسی لگتی ہیں جیسے یرقان کی بیمار ہوں۔ دروازے اتنے ڈھیلے ہوتے ہیں کہ ہوا کے جھونکے سے پٹاخے بجاتے ہیں۔ مریضوں کو لائن میں کھڑا ہونے کے لیے برآمدے کے آگے چھپّر ڈال کر ایک دو بینچ یا کچھ کرسیاں رکھ دی جاتی ہیں، جن پر بیٹھتے وقت ڈر لگتا ہے کہ کہیں ہچکولا تو نہیں آئے گا یا ہڈّی پسلی تو نہیں ٹوٹ جائے گی۔ اگر بیت الخلا کی ضرورت پڑ جائے تو مریض مجبور ہو کر جتنی تیزی سے اندر جاتا ہے اتنی تیزی سے باہر آتا ہے۔ سڑاند سے اس کی ناک رونے لگتی ہے۔ ہاتھ دھونے کے لیے نل سے پانی یوں ٹپکتا ہے جیسے برسات کے بعد پیڑوں کے پتوں سے۔ پینے کے پانی کا انتظام شفاخانہ کی تواریخ میں نہیں لکھا ہے۔ شاید ڈاکٹر سمجھتے ہیں کہ شفاخانے کے پانی سے تو گلی کے نل کا پانی پینا بہتر

ہے۔ ادارہ تجربہ یعنی لیبارٹری جہاں خون، پیشاب، پاخانہ وغیرہ کا ٹیسٹ کیا جاتا ہے شاید اس کا اپنا معائنہ کبھی نہیں ہوتا۔

مریض کی جانچ پڑتال کرنے کے لیے تھرمامیٹر، وزن کرنے والی مشین، گلے کے اندر جھانک کر دیکھنے کے لیے ٹارچ جیسے معمولی سے آلے ڈھونڈنے پڑتے ہیں، کیونکہ تین چار ڈاکٹروں کے لیے صرف ایک ہی آلہ ہے جو ایک کمرے سے دوسرے تک گردش میں رہتا ہے۔ کبھی کبھی تو دوائی کا پرچہ لکھنے کے لیے پین ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ ناقابلِ استعمال سُوئی یا پچکاری کو نہ جانے کتنی بار استعمال کیا جاتا ہے۔ شفاخانہ کے باہر گندگی اور کوڑا کرکٹ کے ڈھیر، طشتریوں کی طرح ہوا میں اُڑتے ہوئے کاغذوں کے ٹکڑے، جھاڑو کے تنکے، خون یا پس سے داغ دار کپاس یا پرانی پٹیوں کے حصے وغیرہ دیکھ کر مریض کے ذہن میں سوال اُٹھتا ہے کہ جس بیماری کے علاج کے لیے وہ آیا تھا وہ بھاگ جائے گی یا اپنا شکنجہ اور مضبوط کر لے گی۔ مریضوں اور کارندوں کے شور اور ڈاکٹروں کی بوکھلاٹ سے دل کے مریض کا درجۂ حرارت اور بڑھ جاتا ہے۔

شفاخانے میں دوا مریض کی ضرورت کے مطابق نہیں دی جاتی۔ وہی دوا دی جاتی ہے جو اسٹور میں ہے چاہے وہ مریض کو موافق آئے یا نہ آئے۔ ایک مریض نے ڈاکٹر سے شکایت کی۔ ''ڈاکٹر صاحب! جو دوا آپ نے لکھ کر دی تھی چار دن کھانے کے بعد بھی کوئی فرق نہیں پڑا۔ میں نے پڑوس میں ایک دوا فروش کو پرچہ دکھایا۔ اُس نے کہا یہ دوا تو قبض دور کرنے کے لیے ہے۔ مگر آپ سے تو دست روکنے کے لیے دوا مانگی تھی۔''

ڈاکٹر نے دوائی کے پرچہ پر سرسری نگاہ ڈالتے ہوئے کہا ''میں کیا کروں۔ میں تو وہی دوا لکھوں گا جو شفاخانے میں ہے۔ سرکار کی سخت ہدایت ہے کہ کوئی دوا بغیر ناظم کی منظوری کے باہر سے نہیں خریدی جائے۔ منظوری لینے میں کم سے کم ایک ہفتہ لگ جاتا ہے۔''

مریض نے حیرانی سے پوچھا ''تو آپ نے دوا دی کیوں؟''

ڈاکٹر نے بڑے اطمینان سے جواب دیا ''اگر میں آپ کو دوائی نہیں دیتا آپ باہر جا کر واویلا کرتے۔ یہ کیسا شفاخانہ ہے؟ ایک معمولی سے بیماری کے لیے بھی دوا نہیں

ہے۔'' پھر ڈاکٹر ہنس کر کہنے لگا'' یہ دوا آپ کے ڈھیلے پاخانے کو بند کرنے کے لیے نہیں دی تھی۔ آپ کا منہ بند کرنے کے لیے دی تھی۔''

ایسے کئی مریض آتے ہیں جن کو مناسب دوا نہیں ملتی۔ کئی دوائیاں سرکاری ملازموں اور دوائیں مہیا کرنے والوں کی ملی بھگت سے اور بدانتظامی سے اصلی میں نقلی ایسے مل جاتی ہیں جیسے دودھ میں پانی۔ ہفتے میں ایک بار کان ناک اور گلا، قلب کی دھڑکن، جوڑوں کا درد، خارش، کھجلی، خراش اور آنکھوں وغیرہ کا مخصوص ڈاکٹر یعنی اسپیشلسٹ آتا ہے جس کا وقت عموماً نو بجے سے بارہ بجے تک ہوتا ہے۔ اُس دن مریضوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ بیس تیس مریضوں کو دیکھنا کوئی خالہ جی کا گھر نہیں۔ وہ بھی صرف تین گھنٹے میں، جس سے بیس منٹ چائے کے نکال دیجیے۔ جلدی جلدی مریضوں کو نپٹانے کی کوشش میں یا تھک جانے سے ڈاکٹر کو بھی خیال نہیں رہتا کہ وہ کیا دیکھ رہا ہے۔ اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ مریض کو سمجھا سکے یا دوا کی پرچی پر دوبارہ نظر ڈال سکے، کہیں غلط دوا تو نہیں لکھ دی۔

ایک دن ایک مریض ڈاکٹر کے پاس آیا اور کہنے لگا'' ڈاکٹر صاحب، مجھے پیشاب رُک رُک کر آتا ہے۔ رات کو پانچ چھ بار اُٹھنا پڑتا ہے۔'' ڈاکٹر نے پوچھا'' ایسا کب سے ہو رہا ہے؟'' مریض نے جواب دیا'' تقریباً ایک مہینے سے۔'' ڈاکٹر نے کہا'' لگتا ہے پیشاب کی نلی یا گال بلیڈر میں کوئی وبائی مرض ہے۔ فی الحال ایک ہفتے کی دوا لکھ دیتا ہوں۔ رات کو سونے سے پہلے ایک گولی روزانہ لے لینا۔ اس دوران میں لیب سے پیشاب کی جانچ کروالو۔ میں نے لکھ دیا ہے۔''

مریض جب وہاں سے لیب گیا تو جانچ کرنے والے نے کہا'' لیب اب بند ہوگئی ہے۔ کل کسی وقت صبح نو سے گیارہ کے بیچ آجانا۔''

اگلے دن جب مریض گیا تو لیب انچارج نے پوچھا'' پیشاب لے آئے ہو؟''

مریض نے جواب دیا'' آپ خالی شیشی دے دیجیے، یہیں کر دیتا ہوں۔''

انچارج نے کہا'' ہمارے پاس کوئی خالی شیشی نہیں ہوتی۔ دوسرے یہ کہ صبح اُٹھ کر پہلے پیشاب کا نمونہ چاہیے۔''

تیسرے دن مریض نمونہ دے آیا۔ انچارج نے کہا ”رپورٹ دو دن کے بعد ملے گی۔ ڈاکٹر کی پرچی ساتھ لے آنا۔“

دو کے تین دن ہوگئے، کیونکہ بیچ میں اتوار آ گیا۔ تین دن گزرنے کے بعد مریض نے لیب سے رپورٹ لی اور ڈاکٹر سے ملنے چلا گیا۔ کیونکہ لائن لمبی تھی، اُسے کھڑے کھڑے چالیس منٹ ہوگئے۔ جب اُس کی باری آئی، ڈاکٹر نے پوچھا ”جانچ رپورٹ لے آئے ہو؟“ مریض نے رپورٹ آگے بڑھائی۔ جب ڈاکٹر نے رپورٹ پڑھی تو وہ ہنسنے لگا۔ مریض کو حیرانی ہوئی۔ ”ڈاکٹر صاحب کیا بات ہے؟“

ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے ”مبارک ہو، آپ حاملہ ہیں۔ پانچواں مہینہ ہے۔“

یہ سن کر مریض ہکا بکا رہ گیا۔ کہنے لگا ”ڈاکٹر صاحب میں تو مرد ہوں۔“

ڈاکٹر نے جواب دیا ”تبھی تو میں ہنس پڑا۔ خیر دریافت کرتا ہوں۔ ضرور کوئی گڑبڑی ہوئی ہے۔ آپ پرسوں پھر آ جانا۔ اتنے میں تفتیش کروالوں گا کہ ماجرہ کیا ہے؟“

لیب کے ساتھ بیت الخلا تھا جہاں لیب انچارج کونے میں رکھی ایک چھوٹی سی میز پر پیشاب کے نمونے شیشیوں میں بند اکٹھا کرتا تھا۔ گیارہ سے ایک بجے تک وہ اُن کی جانچ کرتا تھا۔ ایک دن کیا ہوا، وہ اپنی سیٹ پر نہیں تھا۔ اتفاق سے مہترانی صفائی کرنے کے لیے آئی۔ جب وہ بیت الخلا کو صاف کر رہی تھی اُس کا جھاڑو میز پر پڑی شیشیوں کو لگا۔ چار پانچ شیشیاں نیچے گر پڑیں۔ اُس نے انھیں اُٹھا کر میز پر رکھ دیا۔ مگر جب اُس نے دیکھا کہ ایک خالی ہے، وہ گھبرا گئی۔ اُس کا ڈھکن کھل گیا تھا۔ ایسی لاپرواہی وہ پہلے بھی دو بار کر چکی تھی۔ اس کو شفاخانے کے انچارج (سی ایم او) نے آگاہ کیا تھا کہ اگر اس نے ایسی بیہودہ غلطی پھر کی تو اُسے نوکری سے نکال دیا جائے گا۔ ڈر کے مارے اس نے جھٹ سے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ شیشی میں اپنا پیشاب ڈالا اور اُسے ڈھکن لگا کر میز پر رکھ دیا۔ شیشی اُسی مریض کی تھی جس کو ڈاکٹر نے حاملہ بتایا تھا۔ مہترانی کی نوکری گئی اور مریض نے راحت کی سانس لی۔ جب مریض کی بیوی نے رپورٹ دیکھی تو وہ کہنے لگی ”میری بھی جانچ کراؤ، کہیں میں مرد تو نہیں بن گئی۔“

OO

نکاح

جب جاوید کے میٹرک میں پاس ہونے کی بھنک نزدیکی رشتے داروں اور دوسرے کچھ جان پہچان والوں کے کانوں میں پڑی، جن کے گھروں میں جوان لڑکیاں شادی کی انتظار میں بیٹھی تھیں، ان میں کانہ پھوسی شروع ہوگی۔ وہ کب سے اس دن کی انتظار میں بیٹھے تھے۔ جب کبھی وہ جاوید کے والد خلیل احمد کے پاس اپنی لڑکی کے رشتے کے لیے جاتے وہ ہمیشہ یہی کہتا "پہلے اُسے دسویں پاس کرنے دو۔"

خلیل احمد کی مرزاپور میں قالین اور غالیچے بنانے کی درمیانہ سائز کی ایک فیکٹری تھی جس میں دس کھڈّیاں تھیں اور کوئی پندرہ کاریگر ایک شفٹ میں کام کرتے تھے۔ مال کی مانگ بڑھنے پر دوسری شفٹ بھی چلتی تھی۔ اچھا کام تھا۔ اُس کا خیال تھا میٹرک کرنے کے بعد وہ جاوید کو بھی اپنے ساتھ کاروبار میں لگا دے گا۔ اِکلوتا لڑکا تھا جس پر وہ اپنی جان چھڑکتا تھا۔ اپنے ساتھ کام میں لگانے کا ایک نظریہ یہ بھی تھا کہ جاوید ہمیشہ اُس کی آنکھوں کے سامنے رہے گا۔ دو لڑکیاں تھیں جن کا نکاح ہو چکا تھا۔

خلیل احمد کٹّر مسلمان تھا۔ قرآن خواں اور روزہ دار تھا۔ ہر آیت و حدیث کو سمجھتا تھا۔ پانچ وقت بلا ناغہ نماز پڑھتا تھا۔ کوئی لت یا بری عادت نہیں تھی۔ نہ شراب پیتا تھا، نہ سگریٹ، نہ سینما دیکھنے کا شوق تھا، نہ مجرا سننے کا۔ فیکٹری سے کوئی دو فرلانگ دور ایک مسجد تھی جس کے امام سے اُس کی ایک طرح سے دوستی تھی۔ فرصت کے وقت وہ جا کر امام سے

اسلام کے بارے میں مزید باتیں پوچھتا تھا۔ وہ کٹّر رجعت پسند تھا۔ حضرت محمد اور قرآن شریف کے خلاف کوئی بھی تنقید سننے کے لیے تیار نہیں تھا، یوں کہو بھڑک اُٹھتا تھا۔ رجعت پسند ہونے کی وجہ سے کئی لوگ عموماً اُسے توہم پرست سمجھتے تھے۔ وہ جدّت پسندی کے سخت خلاف تھا۔ اگر وہ کسی مسلمان عورت کو حجاب کے بغیر دیکھ لیتا تو یہ کہنے سے نہیں چوکتا تھا "بی بی چہرہ ڈھک کر رکھو" چاہے وہ عورت اجنبی کیوں نہ ہو۔ اگر کسی مسلمان کو شراب پیتے ہوئے دیکھ لیتا تو کہتا "مسلمان ہو کر نشہ کرتے ہو۔ قیامت کے دن کیا جواب دو گے۔" کئی نوجوان اُس کے وعظ کو نہ صرف نظر انداز کر دیتے بلکہ اُس کا مخول بھی کرتے۔

ایک دوپہر جب جاوید کھانے کے لیے گھر آیا تو اُس کی والدہ نے کہا "بیٹا، آج شام کو پانچ بجے گھر آ جانا" پھر اُس نے استری کیا ہوا کُرتا پاجامہ پکڑاتے ہوئے ہدایت کی "گھر آتے ہی کپڑے بدل لینا اور ٹوپی بھی بدل لینا۔" جاوید نے جب وجہ پوچھی تو اماں نے جواب دیا۔ "کچھ لوگ تجھے دیکھنے آ رہے ہیں۔"

جاوید نے پوچھا "وہ کیوں؟"

"تیرا نکاح جو کرنا ہے۔ وہ لوگ لڑکی کے والد شریف اور اُن کے دور شتے دار ہیں۔" ماں نے جواب دیا۔

"مگر ماں یہ بات پہلے بھی کئی بار ہو چکی ہے۔ میں ابھی نکاح نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے کاروبار بڑھانے کی زیادہ فکر ہے۔ میری عمر ہی کیا ہے؟ صرف بیس۔ دو چار سال اور رُک جانے میں ہرج ہی کیا ہے؟"

ماں کے تیور بدل گئے۔ وہ غصّے سے کہنے لگی۔ "جب تیرے ابّو کی شادی ہوئی تھی وہ سولہ سال کے تھے اور میں بارہ کی۔ تُو تو بیس سے اُوپر ہے۔ ہم زیادہ دیر رُک نہیں سکتے۔"

"ماں تب کی بات اور تھی۔ زمانہ بدل گیا ہے۔"

جاوید نے سوچا ماں سے بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ بھی ابّو کی طرح رجعت پسند تھی۔ وہ چپ کر کے چلا گیا۔ چار بجے جب وہ فیکٹری سے نکل کر جانے لگا تو ابّو نے پوچھا۔

"بیٹا جاوید گھر جا رہے ہونا؟" جاوید نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مگر وہ گھر نہیں گیا۔ شام کو کوئی سات بجے وہ گھر گیا۔ اندر داخل ہوتے ہی خلیل احمد اُس پر برس پڑا اور کہنے لگا "اِس بار تو میں تجھے معاف کر دیتا ہوں۔ اگر ایسی احمقانہ حرکت تُو نے پھر کی تو تجھے گھر سے نکال دوں گا۔"

جاوید کو فکر ہوگئی۔ وہ اپنے والدین کو کب تک اور کیسے ٹال سکتا تھا۔ لڑکی والے اور بھی آئیں گے۔ جب ابّو اور اماں نکاح کی باتیں کرتے تو اُس نے اندازہ لگا لیا کہ لڑکی والوں کی تو لائن لگی ہوئی ہے۔ لڑکی کو پسند کرنے کا اُسے کوئی حق نہیں تھا۔ کیونکہ ایسا کرنا مذہب کے خلاف تھا۔ مذہب کے خلاف جانا خدا کو ناراض کرنا تھا، جو مرنے کے بعد خلافِ ورزی کرنے والے کو سیدھے دوزخ میں ڈال دیتا ہے۔ ایسے جیسے لوہے کو بھٹی میں۔ وہ جانتا تھا کہ اسلام کی ذرا سی بھی نکتہ چینی کرنا ابّو کو طیش دلاتا تھا۔ وہ ابو سے ڈرتا تھا۔ وہ اُن کی ضد اور اڑیل پن سے اچھی طرح واقف تھا۔ اُس کو خیال آیا کہ وہ کیوں نہ اپنی امّی سے صاف صاف کہہ دے کہ وہ لڑکی کو دیکھ کر ہی ہاں کرے گا۔ جب اُس نے اس بات کا ذکر ماں سے کیا وہ تلملا اُٹھی۔ کہنے لگی "جاوید، تجھے کیا ہوگیا ہے؟ کیسی دقیانوسی باتیں کر رہا ہے۔ ہمارے مذہب میں لڑکی کو گھر کی بڑی عورتیں پسند کرتی ہیں اور لڑکے کو لڑکی کے گھر کے بزرگ۔ لڑکے لڑکی کا شادی سے پہلے ملنا گناہ ہے۔ اگر تو نے ایسی بات ابّو سے کہی تو وہ تجھے کافر سمجھ کر گھر سے بے دخل کر دیں گے۔ کہاں جائے گا تو؟ کیا کرے گا؟"

کئی لوگ جاوید کو دیکھنے آئے۔ بہتوں کو لڑکا پسند تھا مگر جاوید کے گھر کی بڑی عورتوں کو کوئی لڑکی پسند ہی نہیں آتی تھی۔ جب وہ لڑکی والوں کو انکار کر دیتے، جاوید راحت کی سانس لیتا اور بہت خوش ہوتا۔ اُسے تو یہ بھی اختیار نہیں تھا کہ وہ لڑکی کے بارے میں پوچھے کہ کتنی عمر ہے؟ کیا کرتی ہے؟ کتنا پڑھی لکھی ہے؟ دیکھنے میں کیسی ہے؟ گھر کا کام کاج جانتی ہے کہ نہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔

جاوید اپنی ضد پر اڑ گیا کہ لڑکی دیکھے بغیر نکاح کے لیے ہاں نہیں کرے گا۔ مگر یہ بات

وہ اپنے ابّو کو کہنے سے بہت ڈرتا تھا۔ خلیل احمد بے وقوف نہیں تھا۔ اس کی بیوی اُسے ساری بات بتا دیتی۔ اُس نے سوچا جب جاوید اس موضوع پر تبصرہ کرے گا وہ اُسے ایسے آڑے ہاتھوں لے گا کہ وہ ہاتھ پکڑ کر معافی مانگے گا۔

ایک رات جب تینوں باورچی خانے میں چٹائی پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے، خلیل احمد نے کہا" کل شام چھ بجے مشتاق میاں اور اُس کے بڑے بھائی جاوید کو دیکھنے آ رہے ہیں۔ مجھے جہاں تک یاد ہے جاوید کی دادی ان کو جانتی ہے اور لڑکی کو بھی دیکھ چکی ہے۔ لڑکی سمجھ دار اور خوبصورت ہے۔ گھر کا سارا کام کاج جانتی ہے۔ ہمیں اور کیا چاہیے؟ اگر لڑکی والوں کو جاوید پسند آ جاتا ہے تو ہمیں فوراً ہاں کر دینی چاہیے۔ کیا خیال ہے تمھارا؟"

جاوید کی ماں نے اپنے شوہر کی ہاں میں ہاں ملا دی۔ جاوید نے صحیح اندازہ لگایا کہ اب وہ ازدواجی زندگی میں جکڑا جانے والا ہے۔ عموماً اپنے ابّو کے سامنے وہ تحمل سے کام لیتا تھا۔ اُس دن نہ جانے کیا ہوا، اُس نے صاف الفاظ میں مستقل مزاجی سے کہا" میں لڑکی خود پسند کیے بغیر نکاح نہیں کروں گا۔" یہ سن کر خلیل احمد کو ایک بار جھٹکا تو لگا۔ اس دن فیکٹری میں کام زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ تھکا ہوا تھا۔ اُس نے جاوید کو کچھ نہیں کہا۔ اُٹھ کر چلا گیا اور آرام گاہ میں جا کر سو گیا۔

اتفاق سے اگلے دن مشتاق میاں اور اُس کا بھائی جاوید کو دیکھنے آئے۔ تھوڑی بات چیت کے بعد مشتاق میاں اپنی لڑکی کا نکاح جاوید کے ساتھ کرنے کے لیے راضی ہو گئے۔ مگر خلیل احمد نے کہا" آپ مجھے سوچنے کے لیے دو دن کی مہلت دیجیے۔"

مشتاق میاں اپنے بھائی کے ساتھ واپس چلا گیا۔ رات کو کھانے کے بعد پھر نکاح کا ذکر آیا تو جاوید نے کچھ گستاخی سے کہا" میں آپ کو کتنی بار کہہ چکا ہوں کہ میں لڑکی دیکھے بغیر نکاح نہیں کروں گا۔"

خلیل احمد اُس رات تھکا ہوا نہیں تھا۔ خوش قسمتی سے اُس کا مزاج بگڑا ہوا نہیں تھا کیونکہ اُس کو رُوس سے قالیچے مہیا کرنے کے لیے بہت بڑا آرڈر ملا تھا۔ اُس نے جاوید کو

نرمی سے سمجھاتے ہوئے کہا: ''بیٹا، میں تمھارا دشمن نہیں ہوں۔ مگر میں مذہب کا پابند ہوں۔ ہم اسلام کے اصولوں کے خلاف نہیں جاسکتے۔ اگر میں نے ایسا کیا تو خدا تعالیٰ مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا۔''

اپنے ابّو کی نرمی کو دیکھتے ہوئے جاوید ماننے کی بجائے اور چوڑا ہو گیا، کہنے لگا۔ ''میں تو ہم پرست نہیں ہوں۔ میں آج کل کے روشن خیالات کا گرویدہ ہوں۔ آخری بار کہے دیتا ہوں کہ میں لڑکی کو پسند کیے بغیر نکاح نہیں کروں گا۔'' خلیل احمد کا مزاج ٹھنڈا تو پہلے ہی ہو چکا تھا اب پگھل گیا۔ اُس نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا ''یہ رسم و رواج میرے بنائے ہوئے نہیں ہیں۔ صدیوں سے چلے آ رہے ہیں'' پھر ہنس کر کہنے لگا۔ ''تم لڑکی کو نکاح سے پہلے دیکھنا چاہتے ہو۔ میں نے تمھاری ماں کی شکل تمھارے پیدا ہونے کے بعد دیکھی تھی۔''

OO

شادی کی شرط

پرتاپ گڑھ کے مہاراجہ لکھن پال سنگھ کی بیٹی منورما کماری بہت ہی خوبصورت تھی۔ اُسے اپنی خوبصورتی کا اتنا گھمنڈ تھا کہ شادی کے لیے اُسے کوئی راج کمار پسند ہی نہیں آتا تھا۔ چوبیس سال کی ہوگئی تھی۔ مہاراجہ اور مہارانی نے اُسے کئی بار سمجھایا اور دو چار بار غصّہ بھی کیا مگر وہ ہر بار بات کو ٹال دیتی۔ ہندوستان کے ہر کونے سے شادی کے لیے کئی دعوت نامے آئے مگر اُس نے ہر پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ مہاراجہ اور مہارانی کو فکر ستانے لگی۔ اُنھیں سمجھ نہیں آیا کہ منورما شادی کیوں نہیں کرنا چاہتی تھی۔ دن گزرتے گئے مگر اس معاملے میں اُس نے چپّی اختیار کر لی۔ کئی شہزادوں نے اپنے دعوت ناموں کے ساتھ قیمتی نذرانے بھی بھیجے کہ شاید انھیں دیکھ کر اُس کا دل للچا جائے اور آخر میں مان جائے۔ مگر اس نے ان تحفوں کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ مہاراجہ نے کئی جیوتشیوں اور پیر فقیروں سے مشورہ کیا۔ ایک جوتشی نے پیشین گوئی کی ''شادی تو راج کماری کی ضرور ہوگی۔ وقت لگ سکتا ہے۔ مگر شادی نہ آپ کی مرضی سے ہوگی اور نہ ہی راج کماری کی مرضی سے، کسی مجبوری کی وجہ سے وہ شادی کرے گی۔''

مہاراجہ نے اپنے وزیر اعظم سے صلاح مشورہ کیا مگر کوئی ٹھوس نتیجہ نہیں نکلا۔ دن میں دو چار گھنٹے کے لیے منورما اپنے محافظوں کی نگرانی میں محل سے باہر گھومنے چلی جاتی۔ مہاراجہ نے ایک خاص محافظ کو ہدایت کی کہ وہ راج کماری پر کڑی نظر رکھے کہ کہیں راج کماری کو کسی سے عشق تو نہیں ہو گیا۔ مگر ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ ادھر اُدھر گھوم پھر کر واپس محل آجاتی

تھی۔ محل کے اندر وقت گزارنے کے لیے یا تو وہ کوئی کتاب پڑھتی رہتی یا اپنی خاص باندی کے ساتھ چوپڑ کھیلتی رہتی یا محل کے اندر تالاب کے پانی میں تیرتی اور اُچھلتی کودتی رہتی۔ اُسے بناؤ سنگار کا کوئی خاص شوق نہیں تھا۔ مہاراجہ اور مہارانی نے کئی اٹکل پچّو لڑائے مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ تاہم یہ معاملہ نہایت سنگین تھا۔ وہ خاموش نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ انھوں نے سوچا کہ اب شہزادی سے زبردستی کرنی پڑے گی۔ سمجھانے بجھانے اور منّت سماجت کرنے سے اِن تلوں سے تیل نہیں نکلنے والا۔ ایک دن دونوں نے مل کر شہزادی کو خوب ڈانٹا اور صاف الفاظ میں کہا ''اگر تم نہیں مانو گی تو ہم تمھاری شادی زبردستی اپنی پسند کے راج کمار سے کر دیں گے۔ ہم نے تمھیں کئی موقعے دیئے ہیں کہ کسی راج کمار کو چُن لو۔ مگر تم نے سب کو ایسے ٹھکرا دیا جیسے دودھ میں سے مکھی کو نکال کر باہر پھینک دیا جاتا ہے۔''

شہزادی کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا اور وہ رونے لگی۔ مہاراجہ نے کہا ''رونے سے کیا ہوگا؟ ہم تمھیں ساری عمر گھر نہیں بٹھا سکتے۔ جو رواج صدیوں سے چلا آتا ہے، ہم اُس کو ردّ نہیں کر سکتے۔ تم اچھی طرح سے سوچ لو۔ اگر تم نے ایک مہینے کے اندر اپنی رضامندی نہ دی تو ہم وہی کریں گے جو ہم بہتر سمجھیں گے۔''

یہ سن کر راج کماری کے پسینے چھوٹ گئے۔ اب وہ کرے تو کیا کرے۔ وہ شادی کیوں نہیں کرنا چاہتی تھی؟ وہ ڈرتی تھی کہ جو عیش و عشرت اُسے اپنے ماں باپ کے گھر میں آسانی سے مہیّا ہیں اور جو آزادی ہے وہ اُسے سسرال میں نہیں ملے گی۔ یہاں وہ خود مختار ہے، سسرال میں اُس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہوگی۔ وہ اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر پائے گی۔ اسی لیے وہ اپنے ماں باپ کو ٹال دیتی اور اس ٹال مٹول کی کوئی وجہ بھی نہیں بتاتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اُس کے ماں باپ کبھی نہیں مانیں گے۔ وہ ہوشیار تھی اور تھوڑی بہت چالاک بھی۔ کئی دن تک وہ سوچتی رہی کیا جواب دوں۔ دماغ پر کافی زور ڈالنے کے بعد اُس نے کہا ''ٹھیک ہے۔ میں شادی کرنے کے لیے تیار ہوں مگر ایک شرط پر۔ جو آدمی، چاہے وہ راج کمار ہو یا عام شہری، مجھے ساری رات ایک ہی کہانی سنائے گا اُسی سے شادی کروں گی۔ اگر کہانی سناتے سناتے وہ رُک گیا تو اُسے موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے گا۔''

وہ جانتی تھی کہ یہ شرط اتنی کڑی تھی کہ کوئی نوجوان آگے قدم رکھنے سے پہلے دس بار سوچے گا۔ مہاراجہ اور مہارانی کو یہ شرط عجیب لگی۔ پھر بھی وہ شہزادی کی بات مان گئے۔ سب جگہ اعلان کروادیا گیا۔ دو چار نوجوان ہمت کر کے آگے آئے اور کہانی سنانے کے لیے تیار ہو گئے۔ شہزادی نے اُنھیں کہانی پوری نہ کرنے کے انجام سے آگاہ کر دیا۔ ایسا لگتا تھا وہ سر پر کفن باندھ کر آئے تھے۔ وہ ہار گئے۔ محل سے اُن کے مردہ جسم ہی باہر نکلے۔ اب ڈر کے مارے کوئی بھی نوجوان اپنی جان کو جوکھم میں ڈالنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ راج کماری بہت خوش تھی کہ اُسے اس مصیبت سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا مل گیا۔ مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ قدرت کسی کو دائمی خوشی نہیں دیتی۔

پھر ایک دن کوئی تین سال بعد ایک عام آدمی دربار میں آیا اور راج کماری کو کہانی سنانے کی پیشکش کی۔ وہ شخص دیکھنے میں بھدّا اور قد میں چھوٹا تھا۔ زیادہ پڑھا لکھا بھی نہیں لگتا تھا۔ شہزادی نے اُسے دیکھ کر اپنا منہ موڑ لیا۔ وہ اُسے پسند نہیں تھا۔ مگر شہزادی نے اپنی شرط کے ساتھ یہ واضح نہیں کیا تھا کہ امیدوار خوبصورت اور جوان ہونا چاہیے۔ بغیر کسی وجہ کے وہ اُس کی پیشکش کو ٹھکرا نہیں سکتی تھی۔ اُس نے دل میں سوچا ''مرنا تو ہے اسے، مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔'' وہ مان گئی۔ کہانی کی رات مقرر کر دی گئی۔ لیکن امیدوار جس کا نام بدری داس تھا اُس نے ہمّت کر کے کہا:

''میری بھی کچھ شرطیں ہیں۔ پہلی یہ کہ کہانی کے دوران شہزادی اُٹھ کر کہیں نہیں جائے گی۔ دوسری یہ کہ کچھ کھائے پیئے گی نہیں۔ تیسری یہ کہ اگر کہانی سنتے سنتے شہزادی کو جھپکی آ گئی تو وہ اپنی ہار مان جائے گی۔ اور آخر میں اگر میں جیت گیا تو شہزادی، مہاراجہ اور مہارانی شادی کے لیے کوئی حیل حجت نہیں کریں گے اور نہ ہی دولت کا لالچ دے کر مجھے کنارہ کشی کرنے کے لیے آمادہ کریں گے۔ شادی اگلے دن ہی کر دی جائے گی۔ اُسی دن میں شہزادی کو لے کر اپنے گاؤں چلا جاؤں گا۔'' کسی نے اُس کی شرطوں کی طرف خاص دھیان نہیں دیا۔ اُن کو یقین تھا کہ ایسا موقع ہی نہیں آئے گا۔ شہزادی نے ساری شرطیں مان لیں۔ اُس کے والدین نے بھی ہاں کر دی۔

آفتاب غروب ہوتے ہی کہانی شروع ہوگئی۔ ایک بہت بڑا زمین دار تھا۔ گوردھن داس چودھری اُس کا نام تھا۔ وہ اپنی زمین میں صرف آموں کے پیڑ لگاتا تھا۔ آموں کی پیداوار میں اُس کی اجارہ داری تھی۔ ملک میں ستر فیصد آم اُسی کے باغ سے مہیا ہوتے تھے۔ اُس کا سب سے بڑا باغ دو میل لمبا اور آدھ میل چوڑا تھا جس کے اندر پانچ ہزار سے زیادہ پیڑ تھے۔ اُن کی دیکھ بھال کرنے کے لیے اُس نے تقریباً ایک ہزار آدمی رکھے ہوئے تھے۔ آم کے موسم میں وہ اُن کی تعداد بڑھا دیتا تھا۔ اُس وقت آموں کی رکھوالی نہایت ضروری تھی، خاص طور پر طوطوں سے بچانے کے لیے۔ جونہی آم پکنے والے ہوتے تھے نہ جانے کہاں سے طوطوں کے جُھنڈ آ جاتے۔ وہ آم کو چونچ مارتے تھے جس سے آم بیکار ہو جاتا تھا۔ شرارتی اور ضدّی بچّے کی طرح طوطہ کھاتا کم تھا نقصان زیادہ کرتا تھا۔ آم کو چونچ مارنا طوطے کے لیے ایک شغل تھا مگر زمین دار کے لیے مصیبت۔

ہر پیڑ کی پانچ چھ شاخیں تھیں۔ ہر شاخ کی کئی ٹہنیاں تھیں۔ ہر ٹہنی سے موسم کے مطابق پانچ سے دس تک آم لٹکتے رہتے۔ ایک صبح جب چودھری کی آنکھ کھلی تو کھڑکی سے اُس کی نظر طوطوں کے ایک بڑے جُھنڈ پر پڑی جو باغ کی طرف جا رہے تھے۔ چودھری فوراً بیدار ہوا اور بغیر منہ ہاتھ دھوئے وہ سیدھا باغ کی طرف گیا۔ وہاں جو نظارہ اُس نے دیکھا اُس کا دل دہل گیا۔ سارا باغ ٹڈّی دَل کی طرح طوطوں سے بھرا ہوا تھا۔ جتنے آم تھے اُس سے زیادہ طوطے تھے۔ اُس نے بڑے مالی کو آواز لگائی۔ وہ پاس ہی ایک جھونپڑی میں رہتا تھا۔ بھاگتا ہوا آیا۔ یہ نظارہ دیکھ کر وہ بھی تذبذب میں پڑ گیا۔ پچھلے سولہ سال سے وہ اس باغ میں کام کر رہا تھا مگر اُس نے اتنے طوطے ایک ساتھ نہیں دیکھے تھے۔ اُس نے فوراً لاٹھی اُٹھائی اور ایک ایک کر کے طوطوں کو بھگانے لگا۔ اتنے میں دیگر مالی بھی آ گئے۔ وہ بھی طوطوں کو اُڑانے میں جُٹ گئے۔ ہر مالی اپنی لاٹھی اُٹھاتا اور کہتا ''اُڑ جا طوطے''۔ جب ایک طوطا اُڑ جاتا وہ دوسرے کو کہتا ''اُڑ جا طوطے''۔ جب دوسرا اُڑ جاتا وہ لاٹھی اُٹھا کر تیسرے کو کہتا ''اُڑ جائے طوطے''۔ پھر چوتھے کو۔ اُس کے بعد پانچویں کو، پھر چھٹے کی باری آ جاتی۔ اگلا نواں، دسواں۔ اور ایک گھنٹے میں مشکل سے پچاس طوطے اُڑ پائے۔ وہ بہت ڈھیٹ

تھے۔اپنے ساتھیوں کی اتنی بڑی فوج دیکھ کر ہر طوطا اور بھی چوڑا ہو گیا تھا۔ایک مشکل اور تھی جو طوطا ایک بار اُڑ جاتا گھوم پھر کر واپس آ جاتا۔مالی طوطے اُڑانے میں لگے رہے۔

شہزادی طوطوں کے نام سے اُوب گئی۔آدھی رات سے زیادہ ہو چکی تھی۔ابھی تک طوطے اُڑ رہے تھے۔شہزادی نے تنگ ہو کر بدری سے کہا ''طوطے ہی اُڑاتے رہو گے یا کہانی کو آگے بڑھاؤ گے۔''

بدری نے دھیمے سے جواب دیا۔''شہزادی جی، گستاخی معاف جب تک طوطے اُڑ نہیں جاتے کہانی آگے نہیں بڑھ سکتی۔''

شہزادی کو غصّہ آ گیا وہ اُٹھ کر چلی گئی۔اگلے دن شہزادی کی شادی بدری داس سے ہو گئی۔مہاراجہ اور مہارانی نے راحت کی سانس لی مگر راج کماری کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔

OO

پگڑی

اس میں کوئی شک نہیں کہ کلونت سنگھ اور بلونت سنگھ اچھے دوست تھے۔ دونوں فیروز پور میونسل کمیٹی میں کلرک تھے۔ تنخواہ تو کوئی خاص نہیں تھی مگر اوپر کی آمدنی سے اُن کا ہاتھ اگر کھُلا نہیں تھا تو تنگ بھی نہیں تھا۔ وہ خواب دیکھتے رہتے کہ اگر ہاؤس ٹیکس محکمہ میں منتخب ہو گئے تو سمجھو پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑھائی میں۔ عمارتوں سے تعلق رکھنے والا کوئی بھی محکمہ کمیٹی میں کام کرنے والوں کے لیے خاص اہمیت رکھتا تھا۔ مگر وہاں وہی بابو چل سکتا تھا جو افسرانِ اعلیٰ کو باقاعدہ حصہ دیتا رہے۔ کلونت کو ایک بار اُس محکمہ میں کام کرنے کا موقع ملا مگر تیز زبان اور زیادہ لالچی ہونے کی وجہ سے چھ مہینے بعد اُس کا تبادلہ ہو گیا۔ اسی طرح بلونت کو بھی ایک موقع ملا۔ مگر موکلوں سے پیسہ بٹورنے میں وہ ڈھیلا اور ناتجربہ کار تھا۔ دراصل اُسے ضرورت سے زیادہ سودے بازی کرنے اور منہ مانگی رشوت سے جھجک محسوس ہوتی تھی۔ اندر سے اُسے تھوڑا بہت یہ احساس بھی تھا کہ رشوت مانگنا اخلاقاً اور قانوناً ناجائز تھا۔ وہ افسران کی اتنی خدمت کرنے میں ناکامیاب رہا جتنی وہ اُمید کرتے تھے۔ آخر میں اُس کا بھی وہاں سے تبادلہ کر دیا گیا۔ تبادلے سے اُسے اتنا رنج نہیں ہوا جتنا کلونت کو ہوا تھا۔

جب وہ کمیٹی میں بھرتی ہوئے تھے اُس وقت اُن دونوں کی عمر مشکل سے سولہ سال تھی۔ کام کرتے کرتے اب انھیں چھ سال ہو گئے تھے۔ ترقی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ترقی کے لیے کلرک کو کم از کم سولہ سال لگ جائیں گے جب اُس کی قسمت کا دروازہ کھلے گا تب وہ اُنسپکٹر کی کرسی پر جا بیٹھے گا۔ دونوں غیر شادی شدہ تھے۔ کیونکہ محکمہ

میں ترقی ہونے کے مستقبل قریب میں کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے۔ انھوں نے سوچا کہ اس چکر میں ازدواجی زندگی کا زیادہ انتظار کرنا بے تکی بات ہے۔ اوپر کی آمدنی سے انھوں نے کچھ پیسہ جوڑ لیا تھا۔ مگر وہ نہ تو کوئی عمدہ کپڑا پہنتے تھے اور نہ ہی موٹر سائیکل خرید سکتے تھے۔ اُن کے ٹھاٹ باٹ کو دیکھ کر لوگ چہ گوئیاں کریں گے۔ حالانکہ سب جانتے تھے کہ کمیٹی میں رشوت کا بازار ہمیشہ گرم رہتا ہے۔ اس کے علاوہ اُنھیں یہ بھی ڈر تھا کہ اگر وہ شان سے رہیں تو کوئی بڑی بات نہیں کہ کمیٹی کے خفیہ محکمہ کی نظر میں آ جائیں اور کوئی سر پھرا اُن کے خلاف پوچھ تاچھ کی کاروائی شروع کر دے۔ جو پیسہ گھوس میں آتا تھا وہ اُسے چھپا کر رکھتے تھے۔ لاکر میں رکھنے سے ڈرتے تھے۔ کہیں چھاپہ پڑ گیا تو نوکری کے ساتھ لاکر کا مال بھی جاتا رہے گا۔

پہلے بلونت کی شادی ہوئی۔ دُلہن ریلوے میں ٹکٹ چیکر کی لڑکی تھی۔ کیونکہ ٹکٹ چیکر کی اُوپر کی آمدنی کافی تھی، بلونت کو جہیز میں اُمید سے زیادہ مال ملا۔ ایک مہینے کے بعد سسر نے اپنے داماد کو کمیٹی کی نوکری سے مستعفی کرا دیا اور اپنے رسوخ سے ریلوے میں کلرک لگوا دیا جہاں ترقی کے امکان زیادہ تھے۔ شادی ہونے کے بعد بلونت کا کلونت سے ملنا جلنا کافی کم ہو گیا۔ ایک تو اُسے وقت نہیں ملتا تھا اور دوسرا وہ ریلوے میں چلا گیا تھا۔ اپنی شادی کے کوئی تین مہینے گزرنے پر بلونت کو کلونت کی شادی کا دعوت نامہ ملا۔ اُس نے فوراً کلونت کو فون کر کے کہا۔ ”مبارک ہو دوست۔ تمھارا دعوت نامہ ابھی ابھی ملا۔ میں اپنی بیوی کو لے کر ضرور آؤں گا“ شادی کے دو دن بعد کلونت کے گھر میں استقبالیہ پارٹی تھی جس کے لیے اُس نے بلونت کو اُس کی بیوی کے ساتھ مدعو کیا۔

پارٹی سے کچھ دن پہلے اُس خاص موقع کے لیے کلونت نے نیا کُرتا اور پاجامہ سلوانے کے لیے عمدہ قسم کا کپڑا خریدا اور درزی کو سلوانے کے لیے دیا۔ اُس نے پگڑی کے لیے بہترین سفید کپڑا خریدا اور رنگ ساز کو اُسے گلابی رنگ میں رنگنے کے لیے دیا۔ سب رنگوں میں اُسے گلابی رنگ بہت اچھا لگتا تھا۔ دونوں کاریگروں کو تاکید کی کہ سپردگی شکروار صبح نو بجے تک ہو جانی چاہیے۔ شکروار کی شام کو چھ بجے پارٹی تھی۔ درزی نے تو وعدے کے

مطابق ایک دن پہلے کُرتا پاجامہ سی کر دے دیا تا کہ کلونت اُسے پہن کر دیکھ لے کوئی کسر تو نہیں رہ گئی۔ دونوں میں کوئی نقص نہیں تھا۔ آزمائش پر کھرے اُترے۔ رنگ ساز جب نو بجے تک نہیں آیا تو کلونت کو فکر ہوئی کہ کیا ہو گیا۔ بارہ بجے تک انتظار کر کے اُس نے اپنے بھتیجے نرنجن سنگھ کو رنگ ساز کی دُکان پر دریافت کرنے کے لیے بھیجا۔ نرنجن نے واپس آ کر کلونت کو بتایا ''چاچو، رنگ ساز کی دُکان بند ہے۔ ساتھ والے دُکان دار سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اُس کا باپ کل صبح مر گیا تھا۔ وہ دُکان کو تالا لگا کر گاؤں چلا گیا۔ اُس نے کچھ نہیں بتایا کہ واپس کب آئے گا۔''

کلونت سنگھ کی پریشانی بڑھ گئی۔ معاملہ کافی پیچیدہ تھا۔ دوسری پگڑی کا انتظام اتنی جلدی نہیں ہو سکتا تھا۔ اُس کو تشویش میں ڈوبا دیکھ کر نرنجن نے کہا ''چاچو، آپ کو یاد ہو گا چاچا بلونت نے بھی اپنی شادی پر گلابی رنگ کی پگڑی باندھی تھی۔ اُس سے جا کر پوچھوں وہ پگڑی اُس کے پاس ہے؟''

کلونت نے کہا ''استعمال کی ہوئی پگڑی میں کیسے باندھ سکتا ہوں۔ اب تک وہ میلی بھی ہو گئی ہو گی۔ اُس کو دھونے اور سکھانے کے لیے وقت چاہیے۔''

نرنجن نے کہا ''چاچو، پوچھنے میں کیا ہرج ہے۔ میں اُس کے گھر جا کر ابھی پوچھ آتا ہوں۔ کوئی دور نہیں ہے۔ آنے جانے میں مشکل سے ایک گھنٹہ لگے گا۔''

آدھے گھنٹے میں نرنجن لوٹ آیا اور آتے ہی کلونت کو خوشخبری سنائی۔ ''چاچو، چاچا بلونت نے وہ پگڑی شادی کے دوسرے دن اُتار دی تھی۔ اُس کو دُھلوا کر اور پریس کروا کر الماری میں سنبھال کر رکھ دی تھی کہ پھر کسی موقع پر پہنوں گا۔ وہ بھول گیا تھا۔ جب میں نے ذکر کیا تو اچانک اُسے یاد آ گیا۔ وہ اندر گیا اور پگڑی تھیلے میں ڈال کر مجھے کہنے لگا۔ بیٹا اسے لیتا ہی جا۔ میں نے کہا میں اپنے چاچا سے پوچھ کر ابھی آتا ہوں۔ پھر چاچو سے کہا ''اب آپ کی مرضی ہے۔ میرے خیال میں تو لے لینی چاہیے۔'' کلونت بہت ہی خوش ہوا اور نرنجن کو پگڑی لانے کے لیے فوراً بھیج دیا۔ وہ بھاگتا ہوا گیا اور پگڑی لے آیا۔

پگڑی صرف سر پر باندھنے کے لیے نہیں ہوتی۔ پگڑی باندھنا ایک دوسرے سے

بدلنا ایک اہمیت رکھتا ہے۔ دوستی کی جڑوں کو مضبوط کرتی ہے۔ عزت افزائی بخشتی ہے۔ کلونت نے سوچا اپنی پگڑی دے کر بلونت نے جو اُس کی عزت افزائی کی ہے اُسے بھی اپنے جذبات کا اظہار کرنا چاہیے۔ اُس نے بلونت کو پنڈال کے گیٹ کے آگے مہمانوں کا استقبال کرنے کے لیے کھڑا کر دیا۔ یہ کام عموماً خاص رشتے داروں کے سپرد کیا جاتا ہے۔ اُس کے باپ اور چاچا نے اعتراض بھی کیا مگر کلونت نہیں مانا۔ جو بھی مہمان آتا وہ اُسے ہاتھ جوڑ کر نمستے کرتا اور خوش اخلاقی سے اُسے خوش آمدید کہتا۔ کبھی کبھی کوئی مہمان ویسے ہی پوچھ لیتا دولہا کہاں ہے۔ بلونت گیٹ پر کھڑا سامنے اشارہ کرتے ہوئے جواب دیتا۔ دولہا وہاں بیٹھا ہے مگر پگڑی میری ہے۔ پانچ چھ مہمانوں سے جب اُس نے ایسا کہا تو کلونت کے کان میں بھنک پڑ گئی۔ قدرتی طور پر اُسے اچھا نہیں لگا۔ اُس نے بلونت سے کہا ''یار، تم یہ کیوں کہتے ہو کہ پگڑی میری ہے۔'' بلونت سر ہلا کر وہاں سے چلا گیا اور گیٹ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اب اگر کوئی مہمان پوچھتا ''دولہا کہاں ہے؟'' تو بلونت جواب دیتا ''دولہا سامنے بیٹھا ہے مگر پگڑی میری نہیں ہے۔'' ایسا کئی بار کہنے پر ایک بار پھر کلونت کے کان میں بھنک پڑی۔ اُس نے بلونت کو بلا کر کہا ''یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ پگڑی میری نہیں۔ تم پگڑی کا ذکر ہی کیوں کرتے ہو۔''

بلونت نے ایک بار سر ہلایا اور وہاں سے جا کر گیٹ کے آگے کھڑا ہو گیا۔ اب اگر کوئی مہمان پوچھتا کہ دولہا کہاں ہے؟ وہ گیٹ کے سامنے پنڈال کے اندر اشارہ کرتے ہوئے کہتا۔ ''دولہا تو سامنے بیٹھا ہے۔ مگر پگڑی کا کوئی ذکر نہیں ہے۔''

OO

گُربہ کُشتن روزِ اول

منگل داس اور بدھ رام اچھے دوست تھے۔ جہاں منگل نے کپڑے بیچنے کی ایک چھوٹی سی دُکان کھول رکھی تھی بدھ نے جوتے بیچنے کی۔ اسکول میں اکٹھے پڑھتے تھے۔ کتابوں کی طرف توجہ کم دیتے تھے، کھیل کود میں ہوشیار تھے۔ اسکول والے شاید ان کو کب کا نکال دیتے اگر وہ ضلع کے سالانہ مقابلوں میں کبڈّی کے جوہر نہ دکھاتے۔ پچھلے پانچ سال سے انھوں نے کبڈّی میں پانچ میڈل حاصل کیے تھے جس سے اسکول کا نام بھی روشن ہوتا تھا۔ سارے شہر میں اس کی چرچا ہوتی تھی۔ مگر یہ کھیل کب تک چلتا۔ جب دونوں دسویں میں دو بار فیل ہو گئے تو اُن کے والدین کو فکر ہوئی۔ کبڈّی نہ تو کوئی کاروبار تھا اور نہ ہی اس کے کرتب دکھانے سے نوکری مل سکتی تھی۔ کیونکہ دسویں کا امتحان محکمہ تعلیم کی طرف سے ہوتا تھا اس میں صدر مُدرس بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ نویں جماعت تک تو صدر کو اختیار تھا کہ وہ نالائق سے نالائق لڑکے کو بھی پاس کر دے۔ اسکول کو اُن دونوں کی ضرورت تھی اس لیے ہر سال وہ اگلی جماعت میں بغیر کسی حیل وحجّت کے جا کر بیٹھ جاتے۔ اب ایسا ممکن نہ تھا۔

دونوں دوستوں کے جسم گٹھیلے تھے اور قد بھی لمبا تھا۔ اگر اسکول میں نہ ہوتے تو پہلوانوں کے اکھاڑے میں اپنی جگہ بنا لیتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسکول کے کئی لڑکے اُن سے ڈرتے تھے کیونکہ تین چار بار انھوں نے بلاوجہ چار پانچ لڑکوں کو پیٹا تھا۔ اُن لڑکوں نے صدر مُدرس سے شکایت کی مگر صدر نے ان کے خلاف کارروائی کرنے کے بجائے سمجھوتہ کروا دیا۔ ان دونوں میں کافی باتیں ملتی تھیں۔ مگر ایک بہت بڑا فرق بھی تھا۔ جیسے منگل کئی باتوں

میں بہت چالاک تھا بدھ سیدھا سادھا تھا۔ اُس میں بھولا پن بہت تھا۔ اگر اُسے منگل کا سہارا نہ ہوتا تو کوئی لڑکے مل کر اُس کو اُلّو بنا دیتے۔ منگل کے ہوتے ہوئے کسی کی ہمت نہیں تھی کہ بدھ سے پنگا لے۔ منگل نے بدھ کو کئی بار سمجھایا اور تاکید بھی کی۔ "یار ہوشیاری سے کام لیا کرو۔ اپنی عقل کا استعمال کرو۔ کسی کے بہکانے میں مت آؤ۔ دنیا بڑی چالاک ہے" مگر بدھ کی فطرت نہیں بدلی۔ مثال کے طور پر کوئی اُن سے کتاب اُدھار مانگتا تو وہ فوراً دے دیتا تھا چاہے اُسے خود ضرورت کیوں نہ ہو۔ لڑکے نے کتاب لوٹائی یا نہیں منگل اپنا مست رہتا تھا۔

جب دو بار دونوں دسویں میں فیل ہو گئے تو اُن کے ماں باپ نے اُن کو اسکول سے نکلوالیا۔ اُنھیں اپنے ساتھ کام پر لگا دیا۔ دو سال کے بعد جب اُن کو تجربہ ہو گیا تو ان کے ماں باپ نے ایک چھوٹی سی دُکان علیحدہ کھلوادی تاکہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سیکھ سکیں۔ منگل کافی چالاک تھا۔ اُس کی دُکان جلدی چل پڑی۔ اُس کے مقابلے میں بدھ کا کام چل تو پڑا مگر اتنی آمدنی نہیں تھی جتنی منگل کی۔ وہ واجبی دام پر مال بیچتا تھا۔ سودا بازی بہت کم کرتا تھا جس سے گاہک کی تسلّی کم ہوتی تھی۔ دونوں اپنے اپنے کام میں اتنا مصروف ہو گئے کہ اُنھیں ملنے اور گپ شپ لگانے کا وقت ہی نہیں ملتا تھا۔ اُن کی عمر کافی ہو گئی تھی اور آمدنی کا ذریعہ بھی بن گیا تھا۔ اُن کے والدین نے اپنی اپنی جگہ ان کی شادی کروادی۔ شادی سے پہلے دونوں یار تھوڑا بہت وقت نکال کر کسی چائے والے کی دُکان یا پارک میں بیٹھ کر بات چیت کر لیتے تھے۔ شادی کے بعد وہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔ دونوں کو اپنی اپنی دُکان اور بیوی کے علاوہ اور کوئی شغل نہیں تھا۔ ایسا لگتا تھا وہ ایک دوسرے کو بھول گئے تھے۔

اتفاق سے دونوں کا ٹکراؤ ریل گاڑی کے ڈبے میں ہو گیا۔ اپنے اپنے کام کے سلسلے میں وہ بنارس جا رہے تھے۔ اتنے وقت بعد جب وہ گلے لگ کر ملے تو اُن کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ خوب گپ شپ کی اور کھایا پیا۔ باتوں باتوں میں بدھ نے پوچھا۔ "منگلے، تیری شادی شدہ زندگی کیسے چل رہی ہے؟" منگل نے بڑے اطمینان سے جواب دیا "بڑے مزے سے۔"

''یار، میں تو اپنی بیوی سے بہت پریشان ہوں۔ بہت رُعب جھاڑتی ہے مجھ پر۔ مجھے ایسا سمجھتی ہے جیسے میں اُس کا غلام ہوں۔ کام میں ذرا سی دیر ہو جائے یا غلطی، بڑے زور سے ڈانٹتی ہے۔ کبھی کبھی تو اتنا چلاّتی ہے کہ پڑوسیوں کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔'' بدھ نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ اندر اندر وہ شرم بھی محسوس کر رہا تھا کہ اُس کا دوست کیا سوچے گا کہ مجھے اپنی بیوی سے ڈر لگتا ہے۔

منگل نے بڑے فخر کے ساتھ ہنستے ہوئے کہا۔ ''یار میری بیوی تو اُلٹا مجھ سے ڈرتی ہے۔ چوں تک نہیں کرتی۔ جو کہوں وہی کرتی ہے۔ میرا اُس پر اتنا دباؤ ہے کہ مجھ سے بات کرنے میں گھبراتی ہے کہ کہیں میں اُسے ڈانٹ نہ دوں۔ ایک بار تو میں نے اُسے تھپڑ بھی مارا۔ وہ کانپ اُٹھی۔''

''بدھ نے پوچھا، یار یہ کیسے ہوا؟''

''سنو میرے دوست۔ یہ ایسے ہوا، شادی کی دوسری رات ہم رسوئی گھر میں نیچے چٹائی پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ اتفاق سے ایک بلّی آ گئی۔ میں نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے بھگانے کی کوشش کی۔ بھاگنا تو ایک طرف رہا وہ اپنی بھوری آنکھیں دکھانے لگی اور منہ کھول کر میاؤں میاؤں کر کے مجھے ڈرانے لگی۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اپنی بیوی کے ہاتھ سے بیلن لے لیا اور بلّی کو نشانہ بنا کر زور سے اُس پر پھینکا۔ بیلن ٹھیک نشانے پر بیٹھا۔ بلّی وہیں کی وہیں ڈھیر ہو گئی۔ بلّی کے دم توڑتے ہی میری بیوی کے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی کہ میں ظالم آدمی ہوں۔ تب سے وہ دَب گئی ہے۔ آج تک اُس نے اپنے منہ سے ایک لفظ بھی ایسا نہیں نکالا جسے سن کر مجھے غصہ آ جائے۔'' منگل نے بڑے فخر سے بتایا۔ بدھ خاموش ہو گیا مگر اُس نے اپنے دل میں ارادہ کر لیا کہ وہ بھی وہی کرے گا جو منگل نے کیا تھا۔

اب ہوا کیا۔ کئی دن تک تو بلّی آئی نہیں۔ اگر دکھائی بھی دیتی تو دُور سے چلی جاتی۔ جب تک وہ نزدیک نہ آئے کوئی بھی ہتھیار استعمال کرنا بے سود تھا۔ بیلن کے دائرہ میں بلّی کا ہونا ضروری تھا۔ کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے۔ آخر وہ ایک دن آ ہی گئی۔ رسوئی کے پاس کھڑی ہو کر وہ دُور سے بدھ اور اُس کی بیوی کو گھور گھور کر کھانا کھاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اُس کے

منہ سے رال ٹپک رہی تھی۔ وہ قیاس لگا رہی تھی کہ کبھی تو دونوں کی نگاہ کھانے کی تھالی کے بجائے کہیں اور پڑے گی۔ اتنے میں بدھ کی نظر بلّی پر پڑ گئی۔ اُس نے ہاتھ ہلا کر بلّی کو چلے جانے کا اشارہ کیا۔ مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ پیچھے ہٹنا تو درکنار وہ دو قدم آگے آ گئی۔ وہ سمجھی شاید بدھ اُسے بچے کھچے کھانے کے لیے دعوت نامہ دے رہا ہے۔ بدھ کو غصہ آ گیا۔ اُس نے رسوئی سے بیلن اٹھا کر بلّی کو نشانہ بنایا۔ نشانہ چوک گیا۔ بیلن بلّی سے کوئی ایک فٹ دور جا گرا۔ خیر بلّی بھاگ گئی مگر بدھ کی بیوی ہنسنے لگی۔ ''لگتا ہے بچپن میں گلی ڈنڈا نہیں کھیلا اور غلیل سے کسی پنچھی کو نشانہ نہیں بنایا۔ دیکھنے میں تو جنگجو لگتے ہو مگر ہو خرگوش جو کسی کے قدموں کی آہٹ سن کر کان کھڑے کر کے بھاگ جاتا ہے۔'' — بدھ کو اپنی بیوی کا طعنہ اچھا تو نہیں لگا۔ وہ سوچنے لگا اگر میں نے منہ کھولا تو سر پر چڑھ کر بولے گی۔ وہ چپ ہو گیا۔ اپنی بے عزّتی کو کڑوا گھونٹ سمجھ کر پی گیا۔

ایک ہفتے کے بعد منگل بدھ سے ملنے گیا۔ ایک دوسرے کی خیر و عافیت پوچھنے کے بعد منگل نے سوال کیا۔ ''بیوی کے ساتھ کیسے گزر رہی ہے؟'' پہلے تو بدھ چپ رہا۔ جب منگل نے اپنا سوال دہرایا تو بدھ نے منہ بناتے ہوئے غمگین لہجے میں کہا ''یار، کیا بتاؤں میں نے تیرا والا نسخہ استعمال کرنے کی پوری کوشش کی۔ پہلے تو کئی دن بلّی نہیں آئی۔ اتفاق سے ایک دن وہ آ ہی گئی۔ میں نے بیلن اُٹھا کر زور سے اُس پر پھینکا۔ بیلن اُس سے کوئی ایک فٹ کی دوری پر جا کر گرا۔ وہ بھاگ گئی۔ میری بیوی ہنسنے لگی اور طعنے مارنے لگی۔ اُس نے مجھے خرگوش کہا۔ میں چپ کر گیا۔ اب وہ مجھ پر زیادہ رُعب جھاڑنے لگ گئی ہے۔ شیرنی بن گئی ہے۔''

منگل نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''میاں، بلّی پہلے دن ماری جاتی ہے۔ اب کوئی اور ترکیب سوچو۔''

OO

بے خوابی کا مریض

ویسے تو دگمبر ناتھ کی ڈیل ڈول اچھی تھی اور صحت مند تھا مگر بے خوابی کا پرانا مریض تھا۔ رات کو نیند قسطوں میں آتی تھی۔ ایک ہلچل سی رہتی تھی۔ آنکھ لگنے کے تھوڑی دیر بعد آنکھ کھُل جاتی تھی۔ ایسا رات کو کئی بار ہوتا تھا جس کی وجہ سے وہ پریشان رہتا تھا۔ دن کو وہ کام پر چلا جاتا اس لیے نیند کی کمی پوری نہیں ہوتی تھی۔ جتنا وہ اس کو پاس بلاتا وہ اتنا دُور بھاگتی۔ رات کو جب بھی نیند کھل جاتی وہ بستر میں لیٹا لیٹا گنتی کرتا رہتا شاید گنتے گنتے نیند آ جائے۔ نیند آ تو جاتی مگر دیر کے بعد۔ ایک بار تو اُس نے ہزار تک گنتی کی تب کہیں جا کر اُس کی دوبارہ آنکھ لگی۔ دفتر میں بیٹھا عموماً نیم خوابیدہ حالت میں کام کرتا تھا۔ جھپکیاں لیتا رہتا یا جمائیاں۔ ایک بار جمائی لیتے وقت اُس کا منہ اتنا کھل گیا کہ اُس کے اندر مکھی چلی گئی۔ دن میں پانچ چھ بار اُٹھ کر غسل خانے جاتا اور آنکھوں پر چھینٹے مارتا۔ دن میں آٹھ نو بار کافی پیتا تا کہ دفتر میں نیند نہ آئے۔ کئی بار پریشانی کی حالت میں اُس کی آنکھیں پُر آب ہو جاتیں۔ افسردگی کی حالت میں اُس نے کئی بار اُوپر والے سے سوال کیا ''بھگوان! میرے ساتھ یہ ناانصافی کیوں؟ آنکھیں تو دیں مگر نیند اپنے پاس رکھ لی۔ بغیر سوئے یا آرام کیے آنکھیں ایسی لگتی ہیں جیسے بیٹری کے بغیر ٹارچ۔'' دو چار دوستوں کے مشورہ پر اُس نے شراب پینی شروع کر دی تا کہ نشے کی حالت میں آنکھ چڑھ جائے۔ آنکھ چڑھ تو جاتی مگر تھوڑی دیر بعد نیچے اُتر آتی۔ نیم خوابی کے مرض نے اُسے سُست بنا دیا۔ کئی علاج کیے۔ ایک خیر خواہ نے صلاح دی۔ ''کسی نفسیاتی امراض کے معالج سے ملو، شاید وہ تمھاری بیماری کی جڑ پکڑ سکے۔'' دگمبر

چکّر میں پڑ گیا۔ کئی ڈاکٹروں اور حکیموں کو دکھا چکا تھا مگر کچھ نہیں ہوا۔ نہ جانے اُس نے کتنی رقم ڈاکٹروں اور حکیموں کی فیس اور دوائیوں پر خرچ کر دی تھی۔

دگمبر نے دل میں سوچا ''ڈاکٹری بھی ایک دُکان داری ہے۔ ان کے پیشے کا ایک ہی مدعا ہے۔ مریضوں کو جتنا بے وقوف بنا کر لوٹ سکتے ہو لوٹ لو۔ جس ڈاکٹر کے پاس جاؤ وہ اپنی رائے دیتا ہے۔ دو ڈاکٹروں کی ایک جیسی رائے بہت کم ہوتی ہے۔ ہر ڈاکٹر اپنی دوا لکھتا ہے۔ دو ڈاکٹروں کا نسخہ ایک دوسرے سے ہی کم ملتا ہے۔ کوئی کہتا ہے سونے سے پہلے بادام روغن سے سر کی مالش کرو۔ کوئی کہتا ہے ماتھے پر زور سے کپڑا باندھ دینا۔ دباؤ سے ٹھیک ہو جائے گا۔'' جب میں نے ڈاکٹر سے کہا ''مجھے سر درد نہیں ہے۔ میں تو نیند نہ آنے کا علاج کروانے آیا ہوں۔'' ڈاکٹر نے بے تکا سا جواب دیا۔ ''ڈاکٹر میں ہوں یا تم!'' ایک دوست نے اپنے خیال کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ ڈاکٹر لوگ بھی کیا کریں۔ آج کل ان کی پڑھائی پر اتنا خرچ ہوتا ہے، کہاں سے پورا کریں گے۔ اگر پہلی بار میں بیمار ٹھیک ہو جائے تو ڈاکٹری چھوڑ کر دفتر میں کلرکی کرنی پڑے گی یا بازار میں پنساری کی دُکان کھولنی پڑے گی۔ چاہے معمولی سی بیماری کیوں نہ ہو ڈاکٹر کئی طرح کے ٹیسٹ کروانے کے لیے کہتا ہے۔ جیسے ایکسرے، خون یا پیشاب کی جانچ، الٹرا ساؤنڈ وغیرہ وغیرہ۔ اُسے اپنی کمیشن سے مطلب ہے، آپ کی جیب خالی ہو جائے اُس سے اُس کو کوئی مطلب نہیں۔ اس کے علاوہ جن دوائیوں کا نسخہ وہ لکھتا ہے وہ اکثر مہنگی ہوتی ہیں۔ ایک ڈاکٹر نے مجھے بتایا کہ اگر وہ سستی دوا لکھ دے تو مریض کی تسلّی نہیں ہوتی۔ تمھیں ایک اور مزے کی بات بتاتا ہوں۔ ایک ڈاکٹر جب نسخہ لکھ چکا تو مریض نے پوچھا۔ ''ڈاکٹر صاحب ان دوائیوں کا کوئی ناموافق اثر تو نہیں ہوگا؟'' ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''دوائیوں کا تو ناموافق اثر نہیں ہوگا مگر بل کا ہو سکتا ہے۔''

ایک مسخرے پڑوسی نے دل لگی کرتے ہوئے اپنی رائے زنی کی۔ ''یار، شادی کر لو۔ جب رات کو بیوی کے ساتھ چھیڑ چھاڑ ختم ہو جائے گی تو اپنے آپ نیند آ جائے گی۔''

دگمبر نے ہنستے ہوئے جواب دیا ''ہر رات چھیڑ چھاڑ کروں گا تو ایک رات ہمیشہ کے لیے سو جاؤں گا۔''

کئی دن سوچ وِچار کرنے کے بعد دگمبر نے فیصلہ کر ہی لیا کہ ایک بار اور کوشش کر کے دیکھتا ہوں۔ اُس نے ڈاکٹر پی. کے. شمبھو سے ملنے کے لیے اُس کے سیکریٹری سے تاریخ اور وقت لے لیا۔ مقرر دن وہ ٹھیک وقت پر پہنچ گیا۔ ڈاکٹر کے پاس بھیجنے سے پہلے سیکریٹری نے اس سے کئی باتیں تفصیل میں پوچھیں جو اُس نے کاغذ پر نوٹ کر لیں۔ اُس نے کہا "آپ ڈاکٹر صاحب کی فیس جما کروا دیجیے۔" جب دگمبر نے پوچھا "کتنی؟" سیکریٹری نے جواب دیا "صرف پانچ سو۔" دگمبر پانچ سو سن کر سُن ہو گیا۔ سیکریٹری نے کہا "جلدی کریئے، اور مریض انتظار کر رہے ہیں۔" مرتا کیا نہ کرتا۔ فیس جمع کرانے کے بعد سیکٹریٹری نے اُسے ڈاکٹر کے کمرے میں بھیج دیا۔ ڈاکٹر نے ایک سرسری نظر مریض پر ڈالی اور دوسری سرسری نظر اس کاغذ پر ڈالی جس پر سیکٹریٹری نے کچھ لکھا تھا۔ اُس نے کہا "تو آپ کو رات کے وقت نیند نہیں آتی؟"

"جی ہاں" دگمبر نے ہلکا سا جواب دیا۔

"بالکل نہیں آتی یا ٹوٹ ٹوٹ کر آتی ہے؟" ڈاکٹر نے آگے پوچھا۔

"جی، ٹوٹ ٹوٹ کر آتی ہے۔"

"کتنے عرصے سے ایسا ہو رہا ہے؟"

"کئی سال ہو گئے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے جب میں پیدا ہوا تھا میری آنکھیں کُھلی ہوئی تھیں۔ دگمبر نے ناموزون جواب دیا۔ ڈاکٹر نے دگمبر کے مزاحیہ جواب کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا "میرے پاس آنے سے پہلے آپ کئی ڈاکٹروں کو دکھا چکے ہوں گے۔ کیا آپ وہ کاغذ لائے ہیں؟"

دگمبر نے جواب دیا "جی ہاں" اور پھر تھیلے سے ایک موٹی سی فائل نکال کر ڈاکٹر کے سامنے میز پر رکھ دی۔ اتنی موٹی فائل دیکھ کر پہلے تو ڈاکٹر گھبرا گیا۔ فائل کو کم از کم سرسری طور پر پڑھنا اخلاقاً ضروری تھا۔ ڈاکٹر نے فائل اٹھائی اور جلدی سے اُس کے اوراق پلٹنے شروع کر دیئے۔ دس منٹ میں فائل کو بند کر کے واپس میز پر رکھ دی۔ دگمبر کو حیرانی ہوئی مگر اُس نے کوئی سوال نہیں کیا۔ کہیں ڈاکٹر بگڑ نہ جائے۔

ڈاکٹر نے کہا "اس فائل سے کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ملتا۔ آپ کو اپنے دماغ کا ایکسرے کروانا پڑے گا۔ فی الحال میں ایک ہفتے کی دوا لکھ دیتا ہوں۔ ایک ہفتے بعد آپ

ایکسرے کی رپورٹ لے کر آ جانا۔"

ایک ہفتے کے بعد دگمبر ایکسرے رپورٹ کے ساتھ ڈاکٹر سے ملنے گیا۔ ڈاکٹر نے ایکسرے کو روشنی میں غور سے دیکھا۔ اُس کے مایوس چہرے سے دگمبر نے اندازہ لگایا کہ رپورٹ سے کوئی سراغ نہیں ملا۔ اُس کا ایسا سوچنا صحیح تھا۔ ڈاکٹر نے اُس کی تصدیق کی۔ ڈاکٹر نے کہا "میں آپ سے کچھ سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔"

دگمبر نے جواب دیا۔ "پوچھئے۔"

ڈاکٹر نے پوچھا۔ "بچپن میں آپ کو سر پر کہیں چوٹ تو نہیں لگی تھی یا آپ کا سر کسی بھاری چیز سے ٹکرایا ہو؟"

"جہاں تک مجھے یاد ہے ایسا کچھ نہیں ہوا۔ نہ ہی میرے ماں باپ نے کبھی کوئی ذکر کیا۔"

"آپ کے ماں باپ کو کبھی دماغی اذیت تو نہیں ہوئی کہ دماغ کا معائنہ کروانا پڑا۔"

"جی نہیں" دگمبر نے تسلّی بخش جواب دیا۔

"آپ کے خاندان میں کسی اور کو ہوئی ہو؟"

"جہاں تک میں جانتا ہوں ایسا کچھ نہیں ہوا۔" دگمبر نے جواب دیا۔

"ڈاکٹر تھوڑا سوچ میں پڑ گیا۔ پھر پوچھنے لگا۔ "آپ کا پیشہ کیا ہے؟"

"دفتر میں کام کرتا ہوں۔"

"کیا کام۔"

"زیادہ تر فائل ورک ہے۔"

"آپ شادی شدہ ہیں؟" ڈاکٹر نے ایک اور سوال کیا۔

"جی نہیں۔"

"آپ کا کوئی شغل۔"

"عشق" دگمبر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

ڈاکٹر ہنس پڑا اور دلچسپی سے پوچھا "آپ کی معشوق کہاں ہے؟ کیا کرتی ہے؟"

دگمبر نے فوراً جواب دیا۔ "ڈاکٹر صاحب۔ اُسی کی تو تلاش کر رہا ہوں۔"

OO

سوامی جی کا وعظ

ٹانڈلا شہر میں مکھن لال پنساری کی دُکان چلاتا تھا۔ روزانہ کی بکری بہت زیادہ تو نہیں تھی مگر اُس کا گزارہ بڑے آرام سے ہو جاتا تھا۔ گھر میں بیوی کے علاوہ دو لڑکے رادھو اور گھنشیام تھے جو پاس کے اسکول میں پڑھتے تھے۔ دُکان میں روزمرّہ ضرورت کی اشیا جیسے دال، آٹا، نمک، تیل وغیرہ آسانی سے مل جاتا تھا۔ چاہے دُکان میں صفائی برائے نام تھی، مگر خریدار پھر بھی چلے آتے۔ کیونکہ زیادہ تر وہ عام درجہ یا غریب طبقہ کے تھے جو خود بھی صفائی جیسی چیز کے بارے میں انجان تھے۔ رات کو جب دُکان بند رہتی اپنے بلوں سے نکل کر چوہے جشن مناتے۔ تقریباً سب اشیا خوردنی بوریوں میں رکھی ہوتیں جن کا منہ اوپر سے کھلا رہتا۔ کیونکہ دُکان میں جگہ تھوڑی تھی اور بیچنے کا سامان زیادہ تھا، وہ دُکان کے باہر کچھ بوریاں رکھ دیتا۔ رات کو اُن بوریوں کو دُکان کے اندر کر لیتا اور دُکان کو تالا لگا دیتا۔ چاہے اُن پر مٹّی دھول پڑتی رہتی تھی مگر کسی گاہک کو کوئی شکایت نہیں تھی۔ سب لوگ کُھلی اشیا خریدنے کے عادی ہو گئے تھے۔ دُکان کی فضا غیر موافق تھی پھر بھی گاہک آتے رہتے تھے۔

مکھن لال پڑھا لکھا آدمی نہیں تھا۔ اُسے اس بات کا کبھی احساس نہیں ہوا کہ کھلی اشیا بیچنا ایک طرح بیماری کو مدعو کرنا ہے۔ کسی گاہک کو مٹّی کا تیل دے کر وہ دوسرے گاہک کو چینی یا آٹا دینے کے لیے ہاتھ نہیں دھوتا تھا۔ وقت وقت پر کوئی نہ کوئی گاہک اُس کو سمجھاتا کہ صفائی کا خیال رکھا کرو۔ مکھن لال کو جواب دیتا۔ "آپ کسی اور دُکان سے خرید لیجیے"۔

جس طرح وہ دُکان میں صفائی کی طرف کوئی دھیان نہیں دیتا تھا اُسی طرح اُسے صاف ستھرے کپڑے پہننے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ کہتا ''میں کیا کروں۔ کبھی سرسوں کے تیل کا چھینٹا پڑ جاتا ہے اور کبھی ہلدی کا داغ، یہ روزمرّہ کا کام ہے۔ اگر میں ایسے کپڑے بدلتا رہوں تو میری ساری آمدنی کپڑوں پر خرچ ہو جائے گا۔'' دیکھنے میں نہ وہ بھدا تھا نہ خوبصورت۔ درمیانہ قد تھا، بکھرے ہوئے بال، چپکی ہوئی ناک اور بے ترتیب مونچھوں سے وہ اپنی ہی طرز کا دُکان دار تھا۔ کام اتنا زیادہ تھا کہ بال کٹوانے کی بھی فرصت نہیں ملتی تھی۔ دو مہینے میں ایک بار نائی کے پاس جا کر بال کٹواتا اور داڑھی اُسترے سے مونڈواتا۔

شہر کی دوسری طرف سوامی دیانند جی مہاراج کا آشرم تھا۔ وہ ان کی رہائش بھی تھی۔ آشرم کافی بڑا تھا۔ اُس کی دیکھ بھال کے لیے اُن کے کئی خدمت گار تھے جو آشرم میں ہی رہتے تھے۔ اس کے علاوہ کئی شہری خاص طور پر عورتیں جن کو سوامی جی کے روحانی علم اور خدا رسیدگی پر اعتماد تھا وہ بھی رضا کارانہ کام کرنے کے لیے آ جاتے۔ باقی سارا شہر گندہ تھا مگر آشرم نہایت صاف ستھرا تھا۔ میونسپل کمیٹی نے ہر مہتر اور مہترانی کو سخت تاکید کر رکھی تھی کہ آشرم کے اِرد گرد کم سے کم ایک سو گز تک کوئی گندگی نہیں ہونی چاہیے۔ سوامی جی کو خوش رکھنا اُن کا عقیدہ تھا۔ سوامی جی مہینے میں دس پندرہ دن کے لیے ٹانڈلا سے باہر وعظ کے لیے چلے جاتے۔ وہ صرف ایک گھنٹے کا لیکچر دیتے تھے۔ اُن کی آواز بڑی میٹھی تھی اور ہونٹوں پر ہمیشہ مسکراہٹ رہتی تھی۔ جیسے ان کو کبھی غصہ آیا ہی نہیں۔ اُن کے پاس پرانی تہذیب کا خزانہ تھا جن میں وید، پوران اور گیتا پر اُن کو مہارت تھی۔ سننے والوں پر سکتہ کا عالم چھا جاتا جیسے انھوں نے سامعین پر جادو کر دیا ہو۔ وہ بڑی سوجھ بوجھی روزمرّہ کی زندگی میں کام آنے والی دلچسپ کہانیاں اور باتیں بڑی آسان اور سیدھی زبان میں سُناتے تاکہ ہر شخص کے دماغ میں بیٹھ جائے۔

مکھن لال سوامی جی کے مریدوں میں سے تھا۔ ہر اِتوار کو بلاناغہ جب سوامی جی کا لیکچر ہوتا تھا وہ سات بجے سے پہلے ہی آشرم پہنچ کر آگے آ کر بیٹھ جاتا تھا چاہے اُسے دُکان جلدی کیوں نہ بند کرنی پڑے۔ شہر کے سبھی لوگ مانتے تھے کہ آندھی ہو یا طوفان، کڑاکے کی

سردی ہو یا بارش وہ ٹھیک وقت سے پہلے آ جاتا تھا۔ لیکچر ختم ہونے کے بعد وہ سوامی جی کے پاؤں چھوتا تھا اور آشرم میں رکھے صندوق میں وہ کچھ نقدی بطور دان ضرور ڈالتا تھا۔ اُس کا سوامی جی سے کوئی خاص تعلق نہیں تھا مگر سوامی جی اُسے بخوبی جانتے تھے۔ جب وہ ان کے پاؤں چھوتا وہ اُسے آشیرواد ضرور دیتے۔ اس کے علاوہ اُن کی ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں ہوتی تھی۔ سوائے سوامی جی اور دُکان کے مکھن لال کو کسی اور چیز میں مٹھاس نہیں ملتی تھی۔ ہاں، کبھی کبھی رام لیلا اور کرشن لیلا دیکھنے چلا جاتا تھا۔ اُس کی نہ کسی سے یاری دوستی تھی اور نہ کوئی نشہ تھا۔ بیوی اور بچوں سے بھی بہت کم بات کرتا تھا۔ اس لیے اُس نے بچوں کی پڑھائی کی طرف کچھ دھیان نہیں دیا۔ جب بڑا لڑکا رادھو میٹرک میں فیل ہو گیا تو مکھن لال نے اُسے اسکول سے نکلوا کر اپنے ساتھ دُکان پر کام میں لگا دیا۔

کچھ مہینے کے بعد ایک دن مکھن لال اپنے بیٹے سے کہنے لگا۔ ''اس اتوار کو تو بھی سوامی جی کا وعظ سننے کے لیے میرے ساتھ چل۔ سوامی جی عالم فاضل ہیں اور خدارسیدہ بھی۔''

گھر سے سوامی جی کے آشرم تک پہنچنے میں کوئی پندرہ منٹ لگتے تھے۔ دونوں باپ بیٹے سات بجنے سے دس منٹ پہلے پہنچ گئے اور اگلی قطار میں بیٹھ گئے۔ راستے میں باپ نے بیٹے کو اچھی طرح سے سمجھایا ''بیٹا، سوامی جی کی باتیں کان لگا کر سننا۔ بڑی اچھی باتیں بتاتے ہیں۔ اگر روزہ مرّہ کی زندگی کے لین دین اور میل جول میں انسان سوامی جی کے بتائے ہوئے اصولوں پر چلے تو یہ مان لو اُس نے زندگی کا مقصد پا لیا۔'' رادھو اپنے باپ کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ جب سوامی جی ہال میں داخل ہوئے تو سب حاضرین کھڑے ہو گئے اور جھک کر سوامی جی کو پرنام کیا۔ سوامی جی نے اُنھیں ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کو کہا اور خود ایک اونچی اسٹیج پر بیٹھ گئے جو پھولوں سے سجی ہوئی تھی۔ بغیر کوئی وقت گنوائے جب انھوں نے وعظ شروع کیا تو ہال میں ایسی خاموشی چھا گئی جیسے وہاں کوئی تھا ہی نہیں۔ سب کی نگاہیں اور کان سوامی جی کی طرف تھے۔

اُس دن سوامی جی نے گائے کے بارے میں کئی اہم تاریخی، تمدنی اور مذہبی باتیں بتائیں۔ انھوں نے خاص طور پر بھگوان کرشن کا ذکر کیا جو گائے چراتے تھے۔ اُن کا گائے

کے ساتھ بہت اُنس تھا۔ وعظ کے دوران انھوں نے گائے کے دودھ کے فائدے بتائے۔ جیسے پیدا ہونے کے بعد بچہ بغیر ماں کا دودھ پیئے تندرست نہیں رہ سکتا ایسے ہی آدمی گائے کا دودھ پیئے بغیر نہ تو ذہین ہوگا اور نہ ہی تندرست۔ گائے کے دودھ سے بنے مکھن دَہی اور گھی اتنے ہی مفید ہیں جتنا دودھ۔ گائے ہماری ماں ہے۔ ہم اسے گوؤ ماتا کہہ کر بلاتے ہیں۔ اس لیے گائے کی ایسی ہی عزّت کرنی چاہیے جیسی اپنی ماں کی۔ اُس کی اچھی طرح سے دیکھ بھال کرنی چاہیے۔ جب وہ دودھ دینا بند کردے اور بوڑھی ہو جائے تو اُسے جنگل میں چھوڑ نہیں دینا چاہیے۔ اُسے گوشالہ میں بھیج دینا چاہیے۔'' آخر میں سوامی جی نے کہا ''ہم نے دیکھا ہے۔ کئی لوگ گائے کو مارتے ہیں۔ یہ پاپ ہے۔ گائے کو مارنا اپنی ماں کو مارنا ہے۔ اس لیے بھولے سے بھی گائے کو کبھی نہیں مارنا چاہیے۔ گائے کو مارنے والا کتنے بھی نیک کام کرے اور پوجا پاٹھ کرے اُسے کبھی بھی جنت نصیب نہیں ہوگی۔'' جب وعظ ختم ہوا تو سوامی جی کے اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہی سب سامعین بھی کھڑے ہو گئے اور تب تک اپنی جگہ سے نہیں ہلے جب تک سوامی جی ہال سے باہر نہیں چلے گئے۔

گھر واپس جاتے ہوئے راستے میں رادھو کا امتحان لینے کے لیے مکھن لال نے پوچھا ''بیٹا، سوامی جی کا وعظ کیسے لگا؟ سوامی جی نے گائے کے بارے میں کیا کہا؟'' جب رادھو نے جو کچھ اُسے یاد تھا اپنے باپ کو بتایا تو وہ بہت خوش ہوا۔ ایک سہ پہر مکھن لال نے رادھو سے کہا: ''بیٹا، میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ میں گھر جا کر تھوڑی دیر آرام کروں گا۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر آجاؤں گا۔ میری غیر موجودگی میں دُکان کا خیال رکھنا۔ اگر تمھیں کسی چیز کا بھاؤ معلوم نہ ہو تو خریدار سے کہہ دینا تھوڑی دیر بعد آجائے۔ ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا اُدھار پر کسی کو سودا مت دینا۔ لوگ مال اُدھار پر لے جاتے ہیں پھر بھگتان کرنا بھول جاتے ہیں۔'' رادھو نے جواب دیا ''ٹھیک ہے پتا جی، آپ فکر مت کیجیے۔ میں پورا خیال رکھوں گا۔''

کوئی پچاس منٹ کے بعد مکھن لال واپس گھر سے دُکان پر آرہا تھا تو اُس نے تھوڑی دُور سے ایک گائے کو چنوں کی بوری میں سے کھاتے ہوئے دیکھا وہ بھاگتا ہوا آیا۔

دُکان کے آگے ایک بڑا سا ڈنڈا رکھا رہتا تھا۔ وہ ڈنڈا فوراً اُٹھا کر مکھن لال نے گائے کی پیٹھ پر زور سے مارا۔ گائے کو جب چوٹ لگی تو وہ وہاں سے بھاگ گئی۔ مکھن لال نے غصّے میں اپنے لڑکے سے کہا ''تو گدی پر بیٹھا سو رہا تھا۔ تجھے دکھائی نہیں دیا کہ گائے چنے کھا رہی ہے۔ بے وقوف کہیں کا۔''

راوھو نے جواب دیا۔ ''پتا جی میں نے تو گائے کو بھگانے کی بہت کوشش کی مگر وہ ملنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔''

مکھن نے تناؤ میں کہا ''تیرے سامنے ڈنڈا پڑا تھا۔ تجھے دکھائی نہیں دیا۔ لگانے تھے دو، اپنے آپ بھاگ جاتی۔'' رادھو نے سنجیدگی سے کہا ''بابو، مگر سوامی جی نے تو کہا تھا گائے ہماری ماں ہے۔ اسے بھول کر بھی نہیں مارنا چاہیے۔ اسے مارنا پاپ ہے۔ آپ نے ہی تو کہا تھا کہ سوامی جی کی نصیحت کو دھیان سے سننا اور اُس پر عمل کرنے کی کوشش کرنا۔''

مکھن لال نے تلملاتے ہوئے جواب دیا ''بے وقوف کہیں کا۔ میں نے تمھیں سوامی جی کا وعظ سننے کے لیے کہا تھا۔ یہ تھوڑی کہا تھا کہ آشرم سے اُسے گانٹھ میں باندھ کر گھر لے آنا۔''

○○

چار وکیل

کہتے ہیں اگر کوئی وکیل جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ میں نہیں بدل سکتا تو وہ ضرورت سے زیادہ سیدھا ہے۔ اگر وہ قصوروار کو بے قصور ثابت نہیں کرسکتا یا ضرورت پڑنے پر بے قصور کو پھانسی پر نہیں لٹکوا سکتا تو وہ اپنے پیشے میں ناکامیاب ہے۔ قانون کی ٹانگ مروڑنا، موکّل کی آنکھوں میں دُھول جھونکنا اور منصف کو گمراہ کرنا ایک تجربہ کار اور مشہور وکیل کی خصوصیات ہیں۔ ان غیر اصولی اصولوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے چار وکیلوں نے اپنی ایک قانونی فرم کھولی یعنی مشترکہ کاروبار شروع کیا۔ فرم کھولنے سے پہلے چاروں کا دھندا بہت مندا تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ صداقت کو اہمیت دیتے تھے۔ چاروں آس پاس بیٹھتے تھے۔ ایک طرح سے وہ ایک دوسرے کے دوست بن گئے تھے اور دوستی کی بنیاد پر انھوں نے مل کر فرم کی بنیاد رکھی۔ شروع شروع میں عدالت بند ہونے کے بعد وہ آپس میں بیٹھ کر قانون کے کئی پہلوں پر تذکرہ اور تبصرہ کرتے تھے جس سے اُن کے قانونی علم کا دائرہ وسیع ہوگیا اور وہ قانون کے داؤ پیچ سے کافی واقف ہوگئے۔ چاروں کی بنیادی رائے اب ایک ہی تھی کہ صداقت کا ہاتھ پکڑ کر چلنے سے موکل کم آتے ہیں۔ فریقین ہر حالت میں اپنا مقدمہ جیتنا چاہتے ہیں۔ وہ وکیل نامور اور قابلِ اعتماد مانا جاتا ہے جو مخالف کے وکیل کے سچ کو جھوٹ ثابت کرے اور اپنے جھوٹ کو سچ ثابت کرے۔

فرم تھوڑے ہی عرصہ میں چل پڑی۔ اب یہ حالت تھی کہ مقدموں کی بہتات سے وکیلوں کو فرصت کم ملتی تھی۔ دماغ سے قانونی بوجھ کو ہلکا کرنے کے لیے وہ ہفتے میں دو یا تین

بار کسی ہوٹل میں کھانے کے لیے چلے جاتے جہاں ایک دو پیگ بھی لگا لیتے۔ آہستہ آہستہ وہ بزم شب یعنی نائٹ کلب میں جانے لگے اور وہاں سے اُن کو نائٹ بازار کا سیدھا راستہ مل گیا۔ سارے دن کی تھکاوٹ اور مارا ماری کو دور کرنے کے لیے ناچ گانا اور تفریح کے کئی لوازمات مل گئے۔ انھوں نے ایسا کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ دروغ گوئی اپنے آپ میں ایک کرشمہ ہے یا الادین کا چراغ ہے جس کو رگڑنے سے شیطان جن کی صورت میں حاضر ہو جاتا ہے اور مُشکل سے مشکل کام آسان کر دیتا ہے۔

جب گرمیوں میں کچہری حسبِ معمول پندرہ دن کے لیے بند ہونے والی تھی تو اُن چاروں دوستوں نے فیصلہ کیا کہ کچھ دن کے لیے وہ اپنی موٹر گاڑی میں راجستھان کی سیر کر کے آتے ہیں۔ ایک تو فضا بدل جائے گی اور دوسرا موکلان سے بھی چھٹکارا مل جائے گا جو چھٹیوں میں بھی گھر آدھمکتے ہیں۔ چاروں کے پاس اپنی اپنی گاڑی تھی۔ مگر نارنگ کی گاڑی بڑی تھی۔ یہی فیصلہ ہوا کہ چاروں اُسی گاڑی میں جائیں گے ویسے بھی اپنی اپنی گاڑی لے جانے میں کوئی تُک نہیں تھی۔

ایک شکروار صبح چھ بجے وہ گھر سے روانہ ہوئے۔ اُنھوں نے سوچا پہلے سیدھا جے پور جائیں گے جہاں ایک رات گزارنے کے بعد کہیں اور جائیں گے جس کا فیصلہ وہ تبھی کریں گے۔ بیکانیر اور جودھ پور سے ہوتے ہوئے وہ اُودے پور کی طرف نکل جائیں گے جو اُن کا آخری مقام تھا۔ وہاں سے وہ سیدھا اپنے شہر اِندور لوٹ آئیں گے۔ اُودے پور کی سیر کر کے وہ صبح اِندور کے لیے روانہ ہو گئے۔ اگر چہ وہ اُن راستوں سے تھوڑا بہت واقف تھے پھر بھی وہ بڑی احتیاط سے گاڑی چلاتے کیونکہ کسی کو بھی گاڑی سے اتنا لمبا سفر خود چلا کر کرنے کا تجربہ نہیں تھا۔ وہ بڑی ہوشیاری اور خبر داری سے گاڑی چلاتے۔ اُودے پور سے کوئی پچاس میل دور وہ بڑے خرام سے جا رہے تھے۔ اچانک گھنے پیڑوں کے جھنڈ کی طرف سے ایک سائیکل سوار آیا اور بغیر اِدھر اُدھر دیکھے سڑک پار کرنے لگا۔ اُس وقت گوسوامی اسّی کلو میٹر کی رفتار سے موٹر چلا رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر سائیکل سوار پر پڑی۔ اُس نے گاڑی کا ہارن بڑی زور سے بجایا مگر سائیکل سوار نے کوئی دھیان نہیں دیا۔ شاید وہ

بہرہ تھا یا کم سنتا تھا۔ اُس کو بچانے کے لیے گوسوامی نے گاڑی دائیں طرف موڑی اور کیونکہ گاڑی تیز رفتار سے جا رہی تھی وہ اپنا توازن کھو بیٹھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے گاڑی نیچے قدرے گہرے ایک کھڈے میں جا گری۔ کیونکہ گاڑی کی چھت سڑک کی سطح سے نیچی تھی کسی اور موٹر سوار نے انھیں نہیں دیکھا۔

کوئی دو گھنٹے بعد پولیس پٹرول کی گاڑی وہاں سے گزری۔ اچانک ایک انسپکٹر کی نظر گاڑی کے ٹائروں کے تازہ نشان پر پڑی جو ڈھلان کی طرف جا رہے تھے۔ اُس نے گاڑی رکوائی اور اُتر کر نیچے کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس کی نظر وکیلوں کی گاڑی پر پڑی جو اُلٹ گئی تھی۔ مگر اُسے کوئی آدمی دکھائی نہیں دیا۔ آہستہ آہستہ ڈھلان سے اُتر کر وہ گاڑی کے پاس آ گیا۔ اُس نے کسی سوار کو گاڑی کے باہر یا اندر پڑے ہوئے نہیں دیکھا۔ اُسے حیرانی ہوئی کہ گاڑی میں جو لوگ سوار تھے وہ کہاں چلے گئے۔ پاس میں نہ تو کوئی میکینک تھا کہ اُسے بلانے چلے جاتے، اور نہ ہی کوئی ڈھابہ تھا جہاں وہ چائے وغیرہ کے لیے گئے ہوں۔ وہ شش و پنج میں پڑ گیا۔ اُس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ کچھ دُور اُسے ایک کسان کھیتوں کو پانی دیتے ہوئے دکھائی دیا۔ انسپکٹر نے اُسے آواز لگائی۔ وہ فوراً وہاں آ گیا۔ انسپکٹر نے پوچھا۔ ''آپ کو کوئی جانکاری ہے کہ یہ گاڑی کب گری؟ اس کے اندر کتنے سوار تھے؟ وہ سب کے سب کہاں چلے گئے؟''

کسان نے اطمینان سے جواب دیا ''حضور، میں نے گاڑی کو گرتے ہوئے دیکھا۔ اس کے اندر چار وکیل تھے۔''

انسپکٹر نے حیرانی سے پوچھا ''تم کیسے جانتے ہو وہ وکیل تھے؟''

کسان نے بڑے آرام سے جواب دیا۔ ''جناب عدالتوں کے چکر لگا لگا کر وکیل کو دُور سے شناخت کر لیتا ہوں۔ چاہے اُس نے کالا کوٹ نہ بھی پہنا ہوا ہو۔ مگر اتفاق سے ان چاروں وکیلوں نے کالے کوٹ پہن رکھے تھے۔ اس لیے اُن کے وکیل ہونے میں شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔''

''مگر وہ گئے کہاں؟'' انسپکٹر نے واجب سوال کیا۔

''جناب، وہ چاروں گاڑی کے اندر دَب گئے تھے۔ میں نے اُن سب کو ایک ایک کر کے باہر نکالا۔ اور گھاس پر لٹا دیا۔ اس سے پہلے میں کسی کو مدد کے لیے بلاتا یا پاس کی چوکی میں پولیس کو اطلاع دیتا میں نے سوچا پہلے ان سے پوچھ تو لوں کہ زندہ ہیں یا مر گئے ہیں۔ میں نے باری باری سے اُن کے کان کے پاس جا کر پوچھا آپ زندہ ہیں؟ دو نے ہاں میں جواب دیا اور دو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا مطلب صاف تھا کہ وہ دو مر چکے تھے۔''

انسپکٹر نے بے تابی سے پوچھا ''مگر وہ ہیں کہاں؟''

کسان نے بنا کسی خوف یا پریشانی کے جواب دیا ''حضور، میں نے سامنے ایک بہت بڑا سا گڈھا کھود کر اُن چاروں کو دفنا دیا۔''

یہ سن کر انسپکٹر بوکھلا اُٹھا۔ ''تم ہوش میں تو ہو۔ یہ کیا کہہ رہے ہو؟ پہلے تو کسی کو دفنانا نہیں چاہیے تھے چاہے وہ زندہ ہو یا مردہ۔ مگر حیرانی کی بات یہ ہے تم نے اُن کو بھی دفنا دیا جو ابھی زندہ تھے جس کی تصدیق تم نے اپنی زبان سے خود کی ہے۔ یہ کیا۔ کیا تم نے؟''

کسان نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا ''جناب، آپ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ یہ وکیل لوگ کتنا جھوٹ بولتے ہیں۔''

OO

میں نے پینا چھوڑ دیا

پنجاب میں موگا کے شمال میں دو میل دُور سوداگر سنگھ بخشی کی سرسوں کا تیل نکالنے کی ایک بڑی سی گھانی تھی۔ کام دن کے ٹھیک آٹھ بجے چالو ہو جاتا تھا اور رات کے سات بجے بلاناغہ گھانی بند کر دی جاتی تھی۔ کام کرنے کے لیے پندرہ کاریگر تھے۔ تیل کو بوتلوں، شیشیوں اور کنستروں میں ڈال کر اُنھیں بند کر دیا جاتا تھا۔ یا سیل کر دیا جاتا تھا۔ اُس کا مال موگا اور اُس کے آس پاس کے علاقوں میں بہت مشہور تھا۔ اس لیے اُسے آمدنی کی کوئی فکر نہیں تھی۔ اگر کسی وجہ سے تیل کی مانگ بڑھ جائے تو وہ زائد وقت نہیں لگاتا تھا۔ اس لیے نہیں کہ کاریگروں کو زیادہ اُجرت دینی پڑے گی۔ دراصل اُس کو کھانا کھانے سے پہلے شراب پینے کی عادت تھی۔ فیکٹری سے نکل کر گھر پہنچتے پہنچتے آٹھ بج جاتے تھے۔ گھر پہنچتے ہی کپڑے بدل کر اور منہ ہاتھ دھو کر اُس کا ہاتھ سیدھا شراب کی بوتل پر جاتا تھا۔ گلاس میں حسبِ مقدار شراب ڈال کر وہ اُس میں سوڈا ملاتا تھا۔ مزے کی بات تو یہ ہے کہ مے نوش تو صرف وہی تھا مگر شراب ایک ساتھ دو گلاسوں میں ڈالتا تھا۔ ایک گلاس میز کے ایک طرف اور دوسرا دوسری طرف رکھ دیتا تھا۔ پہلے وہ ایک گلاس سے گھونٹ پیتا۔ پھر اُٹھ کر دوسری طرف جاتا اور بیٹھ کر دوسرے گلاس سے پیتا تھا چاہے اُسے دس بیس بار اُٹھنا بیٹھنا پڑے اُسے کوئی تکلیف نہیں ہوتی تھی۔ اُس کی بیوی اُس کی عادت سے بخوبی واقف تھی۔ وہ اُسے کچھ نہیں کہتی تھی۔ شادی کے بعد شروع شروع میں اُسے اپنے خاوند کی یہ حرکت عجیب سی لگتی تھی۔ اُس کے دو جوان لڑکے تھے وہ بھی اپنے باپ کی عادت کو اچھی طرح جانتے تھے۔

ایک رات جب سوداگر سنگھ شراب پی رہا تھا کسی نے گھنٹی بجائی۔ وہ خود اُٹھ کر گیا۔ دروازہ کھولا تو جالندھر کے پرانے دوست سنتو کھ سنگھ کو دیکھ کر اُسے حیرانی ہوئی۔ وہ اُسے گلے لگا کر ملا اور اندر لے آیا جہاں وہ بیٹھا شراب پی رہا تھا۔ مہمان کو کُرسی پر بٹھایا۔ اس سے پیشتر کہ وہ مہمان سے پوچھتا کہ کیسے آنا ہوا اُس نے گلاس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

''ہو جائے ایک پیگ''

سنتو کھ سنگھ نے جواب دیا۔''مجھے دل کی بیماری ہے۔ ڈاکٹر نے منع کر رکھا ہے۔ آپ لطف اٹھائیے۔ ہم ساتھ ساتھ باتیں کرتے ہیں۔''

باتوں باتوں میں سنتو کھ سنگھ نے اپنے آنے کا مدعا بتایا۔''یار مجھے بیس ہزار روپے کی سخت ضرورت پڑ گئی ہے۔ میرا دھندا ٹھیک نہیں چل رہا۔ بینک سے قرض لیا تھا جس کی پوری ادائیگی نہ ہونے سے بینک نے عدالت کے ذریعے قرقی کا نوٹس بھیج دیا ہے۔''

سوداگر سنگھ نے خوش اسلوبی سے جواب دیا''بس اتنی سی بات ہے۔ اس وقت گھر میں اتنی رقم نہیں ہے۔ کل بینک سے نکلوا کر دے دوں گا۔ فکر مت کرو۔ رات کو یہاں بے فکری سے سو جاؤ۔''

کھانا ختم کرنے کے بعد سوداگر اور سنتو کھ باتیں کر رہے تھے سنتو کھ نے اشتیاق سے پوچھا۔''یار، ایک بات بتا۔ تو پینے والا تو ایک ہے مگر دو گلاسوں میں کیوں ڈالتا ہے؟''

سوداگر نے سنجیدگی سے جواب دیا۔''یار، بات یہ ہے۔ پاکستان میں میرا ایک مسلمان دوست ہے۔ یہاں آنے سے پہلے وہ میرے پڑوس میں رہتا تھا۔ ہمارا یارانہ تھا۔ ہمیں ایک دوسرے سے اتنا اُنس تھا کہ شاید دو بھائیوں میں بھی نہ ہو۔ دن کا کام ختم کر کے شام کو ہم دونوں اکٹھے بیٹھ کر پیتے تھے۔ تقسیم ہند کے بعد جیسے تم جانتے ہو ہمارا خاندان یہاں آ گیا۔ مجھے بھی ساتھ آنا پڑا۔ مختصر بات یہ ہے کہ دوسرا پیگ میں اُس کی طرف سے پیتا ہوں۔''

سنتو کھ سنگھ ہنس پڑا۔ سوداگر نے آگے کہا'' ہے تو یہ عجیب بات مگر حقیقت یہی ہے۔ ایک چھوٹی سی بات اور بھی ہے۔ میری بیوی مجھے ایک پیگ سے زیادہ نہیں پینے دیتی تھی۔

جوں ہی میں دوسرا پیگ گلاس میں ڈالنے لگتا وہ بڑبڑانے لگتی۔ سارا مزہ کرکرا ہو جاتا۔ میں نے اپنی عقل کے گھوڑے دوڑائے۔ آخر میں مجھے خیال آیا کہ یہی ایک طریقہ ہے دو پیگ پینے کا۔ پہلے تو وہ تلملائی اور کئی بار جھگڑا کیا۔ میں اُس کو ہر بار یہی کہتا اپنے جگری دوست کو کیسے بھول سکتا ہوں۔ جب میں دوسرا پیگ بھرتا ہوں مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے وہ میرے پاس بیٹھا ہے، میں خود ایک سے زیادہ نہیں پیتا۔"

سنتو کھ سنگھ نے دو مہینے کے اندر بیس ہزار روپے سوداگر سنگھ کو واپس کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ دو مہینے سے پہلے ہی اُدھار کی رقم چکانے کے لیے ایک شام کوئی پانچ بجے وہ سوداگر سنگھ کی فیکٹری میں آ گیا۔ سوداگر سنگھ نے کہا "سنتو کھ، ایک بات بتا۔ تجھے اتنی جلدی کیا تھی۔ دوست کس لیے ہوتے ہیں۔ اگر مجھے تجھ پر اعتبار نہ ہوتا تو بنا لکھا پڑھی کے میں تجھے اتنی رقم اُدھار پر کیوں دے دیتا۔"

سنتو کھ نے بات کو بدلتے ہوئے کہا۔ "یار، تیری بھابھی کہہ رہی تھی بازار میں سرسوں کا اصلی تیل نہیں ملتا۔ اپنے دوست کی گھانی سے پانچ کلو کا ٹن لے آنا کئی مہینے چلے گا۔"

سوداگر نے مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ "تمھیں کیا بتاؤں ہم خود اپنی گھانی کا تیل استعمال نہیں کرتے۔"

"میں سمجھا نہیں تمھاری بات کو۔" سنتو کھ نے حیرت سے پوچھا۔ "تو تم کیا استعمال کرتے ہو؟"

"ہم تو ناریل کا تیل استعمال کرتے ہیں۔ تم پوچھو گے اپنی گھانی کا کیوں نہیں استعمال کرتے؟ حقیقت یہ ہے کہ مجھے خود یقین نہیں کہ ہماری گھانی کا تیل اصلی ہے یا نہیں۔ جو مال ہم خریدتے ہیں اُس میں ملاوٹ ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ دُکاندار وہ مال نہیں رکھتا جس میں اُسے کم از کم بیس فیصدی کا فائدہ نہ ہو۔ تیل مہیا کرنے والے بہت ہیں۔ اس لیے بازار میں اپنا سکہ جمانے کے واسطے سستے داموں پر تیل دینا ضروری ہے۔ مال سستا تبھی دے سکتے ہیں اگر اُس میں ملاوٹ ہوگی۔"

سنتو کھ کو یہ سن کر حیرانی ہوئی۔اس نے سنجیدگی سے کہا ''سوداگر، تُو تو کٹر سکھ ہے۔ گورونانک کا عقیدت مند ہے۔تو بھی ایسے کام کرتا ہے جو سکھ دھرم کے اصولوں کے خلاف ہیں۔''

سوداگر نے پرسکون جواب دیا۔''مذہب اپنی جگہ ہے۔ بیوپار اپنی جگہ، دونوں میں آج تک نہ میل جول ہوا ہے اور نہ ہی ہوگا۔''

باتیں کرتے کرتے کافی وقت گزر گیا۔فیکٹری بند کر کے سوداگر اپنے یار کو گھر لے گیا۔منہ ہاتھ دھو کر اُس نے کہا ''یار، تمھاری اجازت ہو تو کھانا کھانے سے پہلے ایک پیگ لگا لوں۔''

سنتو کھ اُس کی عادت کو جانتا تھا۔اُس نے ہنستے ہوئے کہا ''واقعی، مذہب اپنی جگہ ہے شراب اپنی جگہ۔''

''یار، تم تو طعنہ بازی پر اُتر آئے۔تم جیسے سمجھو تمھاری سوچ ہے۔میری سمجھ کچھ اور کہتی ہے۔''

سوداگر ساتھ کے کمرے میں گیا۔ایک گلاس میں پٹیالہ پیگ ڈالا۔اُس میں کچھ پانی ملایا۔گلاس لے کر وہ بیٹھک میں آیا۔میز کے ایک کونے میں گلاس کو رکھ دیا اور خود کرسی پر بیٹھ گیا۔ جب اُس نے گلاس میں سے ایک گھونٹ پیا تو سنتو کھ سنگھ نے کہا۔''یار، کیا بات ہے؟ پچھلی بار میں جب آیا تھا تم نے دو گلاس رکھے ہوئے تھے۔دوسرا گلاس کہاں ہے؟ تمھارا پاکستانی دوست صحیح سلامت تو ہے؟''

سوداگر نے بڑے اطمینان سے جواب دیا ''وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔آج ہی اُس کا خط آیا ہے۔اپنے لڑکے کی شادی میں شامل ہونے کے لیے مجھے دعوت نامہ بھیجا ہے۔''

سنتو کھ نے پوچھا ''وہ تو ٹھیک ہے۔مگر دوسرا گلاس کہاں گیا؟''

سوداگر نے ہنستے ہوئے جواب دیا ''ڈاکٹر کے کہنے پر میں نے پینا چھوڑ دیا ہے۔''

OO

گوشت بنانے کا نسخہ

گگن نگر کے ایک چھوٹے سے شہر میں سردار مکھن سنگھ نے بکرے کا گوشت بیچنے کی دُکان کھول رکھی تھی۔ اُس کے زیادہ تر گاہک سکھ تھے کیونکہ وہ جھٹکا گوشت بیچتا تھا۔ اگر وہ مسلمان ہوتا تو لوگ اُسے قصائی کہتے۔ کیونکہ مکھن سنگھ کو گھر کے لیے علیحدہ گوشت نہیں خریدنا پڑتا تھا اُس کے باورچی خانے میں روز گوشت بنتا تھا۔ اگر دُکان پر گوشت بچ جائے تو گھر کے افراد اُس دن روٹی کھانے کے بجائے گوشت کھاتے تھے۔ گوشت خوری کی اُن کو ایسی عادت پڑ گئی تھی کہ جب کٹا ہوا بکرا فروخت کرنے کے لیے دُکان پر آتا تو مکھن سنگھ اُس میں سے گھر کے لیے کچھ حصہ پہلے ہی نکال لیتا۔ گاہک کو خالی ہاتھ بھیج سکتا تھا مگر رات کو بغیر گوشت کھائے نہیں رہ سکتا تھا۔

مکھن سنگھ شہر کے ایک چھوٹے سے مکان میں اپنی بیوی اور دو لڑکوں کے ساتھ رہتا تھا۔ بڑا لڑکا ملائی سنگھ شادی شدہ تھا اور چھوٹا کھیر سنگھ ابھی کنوارہ تھا۔ کچھ لوگوں سے ایسا سننے میں آیا کہ جب پہلا لڑکا پیدا ہوا تو مکھن سنگھ اُس کا نام ملائی سنگھ رکھنا چاہتا تھا۔ کئی رشتے داروں نے کہا "یہ بھی کوئی نام ہے۔" مکھن سنگھ نے جواب دیا "اگر میرا نام مکھن سنگھ ہو سکتا ہے تو اس کا نام ملائی سنگھ کیوں نہیں ہو سکتا؟" جب اُس نے دوسرے لڑکے کا نام کھیر سنگھ رکھا تو رشتے داروں نے کچھ نہیں کہا۔ دونوں لڑکے باپ کے ساتھ دُکان پر کام کرتے تھے۔ بڑا لڑکا تھوک منڈی سے بکرے لے آتا اور چھوٹا لڑکا باپ کو آرام دینے کے لیے دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد دُکان پر چلا جاتا۔ شام کو باپ کے ساتھ دُکان بند کر کے گھر آ جاتا۔ روز

گوشت کھا کھا کر گھر کے سبھی افراد چوڑائی میں کافی پھیل گئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا مکھن سنگھ تو عام کرسی پر بیٹھ بھی نہیں سکتا تھا۔ ایک بار وہ اتنی بری طرح سے پھنس گیا کہ بڑھئی کو کرسی کاٹنے کے لیے بلایا گیا۔ جس چار پائی پر وہ اور اُس کی بیوی سوتے تھے تین، چار پائیوں کے برابر تھی۔ بوجھ سے چار پائی کی رسّیاں جلدی ڈھیلی پڑ جاتیں۔ سال میں کم از کم تین بار بنوانی پڑتی تھی اور دو بار مرمت بھی کروانی پڑتی تھی۔

ملائی سنگھ تھا تو کافی موٹا مگر اپنے باپ کے مقابلے میں اُس کا وزن آدھا تھا۔ اگر اُس کی بیوی جیتو اُس کا ہاتھ زیادہ کھانے کے لیے نہ پکڑتی تو وہ بھی اپنے باپ کی طرح بھینسا دکھائی دیتا۔ رہا کھیر سنگھ وہ خالی لحیم شحیم تھا۔ کیونکہ جوان تھا اُس کا بڑھا ہوا پیٹ بھدا نہیں لگتا تھا جیسے کہ اُس کے باپ کا۔ اُس کو اپنی ماں کے ہاتھ کا بنا ہوا گوشت بہت پسند تھا۔ اگر اتفاق سے جیتو گوشت بنا دے تو وہ کھانا کھاتے کھاتے اُٹھ کر چلا جاتا تھا۔ گوشت میں اُس کی ماں کون سے مسالے اور دیگر لوازمات ڈالتی تھی یہ وہ ہی جانتی تھی۔ وہ ناپ تول کر نہیں ڈالتی تھی۔ سب کچھ اندازے سے استعمال کرتی تھی۔ مجال ہے کوئی نقص رہ جائے۔ اتنے سالوں سے روز روز گوشت پکا کر اُس کے ہاتھ ناپنے کے آلے بن گئے تھے۔ یہ بات سبھی لوگ جانتے تھے کہ اُس کے ہاتھ کا بنا ہوا گوشت اتنا لذیذ تھا کہ کھانے والے انگلیاں چاٹتے رہ جاتے۔ مہمان تو اس کی تعریف کے پل باندھتے نہیں تھکتے تھے۔ اتفاق سے ایک دن سردارنی ہانڈی میں گوشت پکا رہی تھی کہ اُس کو دل کا دورا پڑا۔ ہاتھ میں ڈوئی پکڑے وہ باورچی خانہ کے فرش پر بچھی چٹائی پر ایسی لیٹی کہ پھر اُٹھی ہی نہیں۔ اُس کی موت سب گھر والوں کے لیے صدمہ تھی۔ اُس کی عمر ہی کیا تھی؟ بیالیس سال مگر کھیر سنگھ کے لیے ماں کی ناگہانی موت ایسے تھی جیسے اُس کے سر پر مصیبتوں کا پہاڑ گر پڑا ہو۔ ماں کے ہوتے ہوئے اُس کو کوئی چیز مانگنی نہیں پڑتی تھی۔ اب بھابھی سے کیسے کہے؟ متلون مزاج ہونے کے علاوہ جب جیتو کا پارا چڑھتا تھا وہ ایسے بولتی تھی جیسے بادل گرج رہے ہوں۔ کوئی بھی اُس سے زیادہ بات کرتے ہوئے گھبراتا تھا۔ وہ اُس سے اپنی بے عزتی نہیں کروانا چاہتا تھا۔ مکھن سنگھ اب باورچی خانہ میں بیٹھ کر نہیں کھاتا تھا۔ اُس کا کھانا تھالی میں ڈال کر اُسے چار پائی پر

بیٹھے بیٹھے دیا جاتا تھا۔ وہ بھی شاید اپنی بہو کے ساتھ کوئی لمبی چوڑی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ گھر میں اب وہ اپنی زبان عموماً تب کھولتا تھا جب نہایت ضروری ہو۔ ماں کے ہاتھ کا بنا ہوا گوشت جب کھیر سنگھ کو ملنا بند ہو گیا تو اُس کی بھوک آہستہ آہستہ کم ہوتی گئی۔ دو مہینے میں اُس کا وزن گھٹ گیا۔ بازار کا کھانا اُسے اچھا نہیں لگتا تھا۔ دُکان پر بیٹھے بیٹھے جب اُسے بھوک ستاتی تو ساتھ میں حلوائی کی دُکان سے کلچے چھولے منگوالیتا تھا اور اپنا پیٹ بھر لیتا تھا۔ ایک دن دُکان پر بیٹھے نہ جانے اُس کے دماغ میں کیا لہر اُٹھی کہ اُس نے کلیجی کے ایک نرم ٹکڑے کو کاٹا اور کھانے لگا۔ وہ اس کو کافی دیر تک چیونگ گم (چبینہ گوند) کی طرح چباتا رہا۔ آہستہ آہستہ وہ کچا گوشت کھانے کا عادی ہو گیا۔ دو مہینے کے اندر نہ صرف اُس کا کھویا ہوا وزن واپس آ گیا بلکہ اُس کا وزن اور بھی بڑھ گیا۔ کیونکہ وہ قد میں چھوٹا تھا اُس کی چوڑائی اتنی بڑی تھی کہ جسم ایک مربع کے طرح لگتا تھا۔

موٹاپے کی وجہ سے کھیر ہنڈولے کی طرح چلتا تھا۔ اُس کا جسمانی توازن بگڑ گیا تھا۔ اُس کو کئی لوگوں نے صلاح دی کہ کچا گوشت کھانا چھوڑ دو۔ مگر اُس کو ایسی لت پڑ چکی تھی کہ کلیجی کو دیکھ کر اُس کا کلیجہ اُچھلنے لگتا۔ اُس کا باپ جانتا تھا کہ کھیر اُس کی دُکان سے غیر موجودگی میں کچا گوشت کھاتا ہے۔ اُس نے کھیر کو کئی بار سمجھایا اور ڈانٹا بھی مگر کوئی فرق نہیں پڑا۔ اُس نے سوچا کیوں نہ کھیر سنگھ کی شادی کر دی جائے۔ شاید اُس کی بیوی کلیجی کھانے کی عادت چھڑوا دے۔ کنور نام کی ایک لڑکی سے شادی ہو گئی۔ اُس نے پوری کوشش کی کہ اُس کا شوہر کچی کلیجی کھانا چھوڑ دے مگر وہ بھی ناکامیاب رہی۔ وہ صبح سیر کو تو جاتا ہی نہیں تھا۔ کوئی کسرت بھی نہیں کرتا تھا۔ ہاں، اگر کنور اُسی طرح کا گوشت بنا سکتی جیسے اُس کے ساس بناتی تھی تو شاید کھیر کلیجی کھانا چھوڑ دیتا۔

گگن نگر سے کوئی سات کلومیٹر دُور فوصلی نام کے گاؤں میں کھیر سنگھ کی چاچی رہتی تھی۔ وہ بیوہ تھی، مگر اُس کا ایک لڑکا تھا جس کا نام رنبیر سنگھ تھا۔ اُن کے پاس زمین کا ایک بہت بڑا ٹکڑا تھا جس پر موسم کے حساب سے وہ سبزیاں اُگاتے تھے اور منڈی میں جا کر بیچ

آتے تھے۔ کھیر سنگھ کی شادی پر مکھن سنگھ نے اُسے دعوت نامہ بھیجا۔ مگر بیمار ہونے کی وجہ سے وہ نہیں آسکی۔ کیونکہ رنبیر کے علاوہ اور کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہیں تھا، وہ بھی نہیں گیا۔ پھر بھی اُس نے کسی کے ہاتھ دُلہن کے لیے سونے کا ہار بھجوا دیا۔ مکھن سنگھ نے کئی بار سوچا وہ جا کر اُس سے مل آئے اور اُسے شادی کا کوئی تحفہ بھی دے آئے مگر وہ نہیں گیا۔ ایک تو وہ کام میں مصروف رہتا تھا اور دوسرا موٹاپے کی وجہ سے وہ سفر کرنے سے گھبراتا تھا۔ گگن نگر سے فوصلی کچی سڑک تھی جس پر صرف ٹانگہ، بیل گاڑی، سائیکل اور پیدل مسافر ہی جا سکتے تھے، سڑک اونچی نیچی ہونے کی وجہ سے تانگے میں ہچکولے آتے تھے جس کی وجہ سے کئی سواریوں کی گردن یا کمر میں درد ہونے لگ جاتا۔ ہچکولوں کا نام سنتے ہی مکھن سنگھ کی کمر میں درد شروع ہو جاتا۔ فوصلی جانا بھی ضروری تھا۔ کافی منّت سماجت کرنے کے بعد اُس نے کھیر سنگھ کو تیار کیا۔ اُس نے اپنے ساتھ ایک پرانے دوست جگدیش کو لے لیا۔

شکروار صبح چھ بجے کھیر اور جگدیش ٹانگے پر سوار ہوئے، راستے میں دو جگہ گھوڑے کو آرام دینے کے لیے تانگے والے نے تانگا روکا۔ کوئی آٹھ بجے وہ فوصلی پہنچ گئے۔ کھیر سنگھ کو دیکھ کر اُس کی چاچی بہت خوش ہوئی اور اُسے گلے لگایا۔ جب اُس نے پوچھا کہ انھوں نے آنے کی اطلاع کیوں نہیں بھیجی تو کھیر نے کہا "چاچی، کام اتنا ہے کہ وقت نکالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ آج ہمّت کر کے آ گیا ہوں۔" اتنے میں رنبیر بھی آ گیا۔ چاچی نے جلدی جلدی سے ناشتے میں مولی کے پراٹھے بنائے جو اُس نے دَہی، مکھن اور تازی لسّی کے ساتھ اُن کے آگے رکھ دیئے۔ انھیں کھا کر دونوں کو بڑا مزا آیا۔ ابھی دوپہر کے کھانے میں کافی وقت باقی تھا۔ چاچی نے رنبیر سے کہا "بیٹا انھیں گھما پھرا لاؤ اور اپنی زمین بھی دِکھا دینا۔ میں اتنے میں دوپہر کا کھانا تیار کرتی ہوں۔ جب وہ ایک بجے لوٹ کر آئے تو کھانا تیار تھا۔ اُنھیں بہت بھوک لگ رہی تھی۔ چاچی نے میمنے کا گوشت بنایا ہوا تھا اور ساتھ میں تندور کی روٹی۔ کھیر سنگھ اپنے گھر میں چاہے روز بکرے کا گوشت کھاتا تھا لیکن بھیڑ کے بچّے کا گوشت پہلی بار کھایا۔ دو لقمے کھانے کے بعد وہ عش عش کر اُٹھا۔ کہنے لگا "چاچی، کیا کمال کا گوشت بنایا ہے۔ میرے خیال میں ایسا گوشت تو پانچ ستارہ والے ہوٹل میں بھی نہیں ملتا ہوگا۔ اُسے

کھا کر مجھے اپنی ماں کی یاد آ گئی۔ وہ بھی ایسا لذیذ گوشت بناتی تھی کہ سب انگلیاں چاٹتے رہ جاتے تھے۔''

کھانا کھانے کے بعد دونوں دوست آرام کرنے کے لیے تھوڑی دیر چار پائیوں پر سو گئے۔ آخری ٹانگا پانچ بجے نکلتا تھا۔ چار بجے کے قریب جب وہ اُٹھے چاچی نے اُن کے لیے شربت بنایا اور پاس کی دُکان سے گرم گرم جلیبی اور سموسے منگوائے۔ کھیر نے کہا ''چاچی، تیرا بنایا ہوا گوشت اگر بچ گیا ہو تو ساتھ لیتا جاؤں۔ بیوی کو کھلاؤں گا اور اس سے کہوں گا ایسا گوشت بنایا کر۔'' چاچی نے کہا ''گوشت تو ختم ہو گیا ہے۔'' کھیر بولا ''اچھا چاچی۔ ایسا کرو مجھے اس کے بنانے کا نسخہ لکھ دو، میں بیوی کو بنانے کے لیے کہوں گا۔'' چاچی نے جواب دیا ''مجھے لکھنا پڑھنا نہیں آتا۔ تو کاغذ پین لے لو۔ میں بولتی جاتی ہوں تم لکھتے جاؤ۔'' کھیر سنگھ نے نسخہ لکھا اور کہیں اُس میں کوئی غلطی یا کمی نہ ہو اُس نے دوبارہ پڑھا۔ چاچی نے تصدیق کی۔ ''بیٹا، بالکل ٹھیک لکھا ہے۔''

پانچ بجے کے قریب دونوں دوست فوصلی سے روانہ ہو گئے۔ کہیں ان کو بڑہ کا گوشت نہ ملے، چاچی نے ایک کلو کچا گوشت کپڑے میں باندھ کر انھیں دے دیا۔ کھیر نے باقی سامان کے ساتھ گوشت کی پوٹلی کو تھیلے میں ڈال دیا۔ آدھے راستے میں تھوڑی دیر آرام کرنے کے لیے تانگہ روکا۔ اپنی ٹانگیں سیدھی کرنے کے لیے دونوں اپنا اپنا تھیلہ لے کر نیچے اُترے اور پاس کے تالاب کی منڈیر پر بیٹھ کر تازہ ہوا کے مزے لینے لگے۔ اتنے میں ایک کتا چپکے سے آیا اور کھیر کے تھیلے کو اُٹھا کر بھاگ گیا۔ اس سے پہلے کہ کھیر اور جگدیش تھیلے کو کتے کے منہ سے بچا پاتے کتے نے تھیلے کو اُنڈیل دیا اور اُس میں سے گوشت کی تھیلی لے کر تیزی سے بھاگ گیا۔ دیکھتے دیکھتے وہ کھیتوں کے پیچھے غائب ہو گیا۔ کھیر کو پہلے تو بڑا افسوس ہوا۔ پھر ہنسنے لگا۔ جگدیش نے حیرانی سے پوچھا ''یار، کتا گوشت کی پوٹلی لے کر بھاگ گیا اور تو ہنس رہا ہے۔'' کھیر سنگھ نے ایک قہقہہ لگایا اور بڑے اطمینان سے کہنے لگا'' بیوقوف ہے سالا، گوشت کو کیا کرے گا نسخہ تو میری جیب میں ہے۔''

OO

بہرا ماسٹر

جُھن جُھن والا میں رائے بہادر جگل کشور ہائی اسکول کافی جانا مانا تھا۔ پانچویں جماعت سے لے کر دسویں جماعت کے لڑکے پڑھنے آتے تھے۔ مخلوط تعلیم کا رواج نہیں تھا۔ لڑکیوں کے لیے علیحدہ اسکول تھا مگر بہت کم ماں باپ اُن کو اسکول بھیجتے تھے۔ جب بھی کوئی لڑکی اسکول جاتی اور واپس گھر آتی، اُس کے ساتھ کوئی نہ کوئی گھر کارکن یا بڑی عمر کی عورت جسے دائی کہتے تھے ساتھ رہتی تھی تا کہ راستے میں کوئی لڑکی سے چھیڑ خانی نہ کرے۔ اسکول کی باہری دیواریں اتنی اونچی ہوتی تھیں کہ کوئی جھانک کر اندر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ لڑکوں کے اسکول کی بنیاد سیٹھ جگل کشور نے کچھ اپنی پونجی اور کچھ سرکار کی مدد سے رکھی تھی۔ زمین داروں اور ساہوکاروں سے بطور عطیہ کافی رقم مل جاتی تھی جس سے اسکول بخوبی چلتا تھا۔ اسکول کا احاطہ کافی بڑا تھا۔ اُس کے اندر کھیلنے کے لیے دو میدان تھے۔ پھولوں کی کیاریاں تھیں جن کو پانی دینے کے لیے ایک ٹیوب ویل تھا۔ کوئی بیس سے زیادہ اُستاد پڑھانے آتے تھے۔ کیونکہ لگ بھگ پچاس میل کے دائرہ میں اور کوئی ہائی اسکول نہیں تھا۔ بہت سے لڑکے دُور دراز علاقوں سے آٹھویں پاس کرنے کے بعد انگریزی اسکول میں پڑھنے کے لیے آتے تھے۔ اُن کے رہنے کے واسطے دو ہوسٹل تھے۔ ایک مسلمان لڑکوں کے لیے اور دوسرا ہندو اور سکھ لڑکوں کے لیے۔ محض ایک اسکول ہونے کی وجہ سے سب لڑکے کسی بھی خاندان سے تعلق رکھتے ہوں ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ پاس ہی یہ برادری برائے نام تھی۔ اُستاد رئیسوں،

امیروں اور اُونچے سرکاری ملازموں کے لڑکوں کی طرف زیادہ توجہ دیتے تھے۔ باقی لڑکوں کا مستقبل اُن کی اپنی محنت اور ماں باپ کے تحفوں پر منحصر تھا۔

ایک چھوٹے سے زمیندار کا لڑکا آٹھویں میں فیل ہو گیا۔ معلوم ہوا اُس نے انگریزی کا پرچا ٹھیک نہیں کیا تھا۔ زمین دار جا کر ٹیچر سے ملا اور کہنے لگا ''آج تک میرا لڑکا پاس ہوتا آرہا ہے۔ اس بار آپ نے اُسے فیل کر دیا۔ کیا بات ہے؟'' ٹیچر نے جواب دیا ''پاس ہوتا نہیں آرہا ہے پاس کیا جاتا ہے۔'' جب زمین دار نے اس کا مطلب پوچھا تو ٹیچر نے بے دریغ جواب دیا۔ ''پہلے آپ ہر سال گیہوں کی بوری میرے گھر بھجوا دیتے تھے۔'' اس سے پہلے کہ ٹیچر اپنی بات پوری کرتا زمین دار نے بڑی حلیمی سے کہا ''معافی چاہتا ہوں بوری سر سے گر گئی تھی۔ کل دس بجے تک مل جائے گی۔'' ٹیچر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''ٹھیک ہے کل بارہ بجے آپ اپنے لڑکے کو جوابی پرچہ کے ساتھ بھیج دینا۔ میں ٹھیک کر دوں گا۔''

کون سا لڑکا واقعی ذہین تھا اس کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ ممتاز شہریوں کے لڑکے اُن کے رُعب داب سے پاس ہو جاتے تھے یا تحفوں سے۔ رہے غریب لڑکے، وہ اُستادوں کے رحم وکرم پر پاس ہوتے تھے۔ کچھ لڑکے سفارش سے بھی کامیاب کر دیئے جاتے تھے۔

جہاں بہت سے لڑکوں کا پڑھائی میں رجحان تھا وہاں کئی لڑکے نکھد، چالاک اور چالو تھے۔ اُن کی کوشش یہی رہتی کہ کسی نہ کسی طرح سے اُستادوں کو باتوں باتوں میں بے وقوف بنا کر پاس ہو جائیں۔ مگر اُستاد اُن کے اُستاد تھے۔ ایک بار جغرافیہ کے پرچے میں ایک سوال تھا۔ ''زمین گول ہونے کے کیا ثبوت ہیں؟'' ایک لڑکے نے ایک لائن میں جواب دیا ''کوٹھے پر چڑھ کر دیکھو زمین گول ہے۔'' ماسٹر جی بھی کوئی کم نہیں تھے۔ انھوں نے نیچے لکھ دیا ''عینک لگا کر دیکھ کر لو نمبر بھی گول ہے۔''

ایک دوسرے لڑکے نے تواریخ کے پرچے میں شاعرانہ انداز سے ٹیچر کو کچھ اس طرح سے مخاطب کیا۔ ''خزانے کی کنجی تیرے پاس ہے۔ تو اگر پاس کر دے تو کیا بات ہے۔''

ٹیچر نے شاعرانہ انداز میں جواب دیا ''کتابوں کی گٹھری تیرے پاس ہے/ تو اگر محنت

کرے تو کیا بات ہے۔'' ریاضی کے ایک ٹیچر نے ایک نکمے لڑکے کو ڈانٹتے ہوئے کہا'' تو اتنا بڑا ہو گیا ہے۔ ریاضی میں عموماً گول انڈا ملتا ہے۔ تجھے شرم آنی چاہیے۔ جب سکندر اعظم تیری عمر کا تھا وہ تیرنا جانتا تھا، گھوڑسواری جانتا تھا، تلوار کا استعمال کرنا جانتا تھا۔ اور ایک تو ہے ریاضی کا ایک سوال بھی ٹھیک نہیں کر سکتا۔''

لڑکے نے بنا کسی خوف اور جھجھک کے جواب دیا'' ماسٹر جی، جب سکندر اعظم آپ کی عمر کا تھا اُس نے آدھی دُنیا فتح کر لی تھی۔''

اگر کسی لڑکے کو اپنی جماعت سے باہر پانی پینے یا پیشاب کرنے کے لیے جانا ہوتا اُسے اُستاد سے اجازت لے کر جانا پڑتا تھا۔ اس کے لیے اسکول میں علامتی زبان کا استعمال کیا جاتا تھا۔ لڑکا منہ سے نہیں بولتا تھا۔ پانی کے لیے ایک انگلی اوپر کر کے ہاتھ ہلانا، پیشاب کے لیے دو اور پاخانہ کے لیے تین۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ٹیچر کی نظر لڑکے پر نہیں پڑتی تھی تو لڑکا مجبوراً اپنی زبان کھولتا تھا'' ماسٹر جی دو'' جس کو وہ دو تین بار دہراتا تھا۔ جب کبھی ماسٹر جی کا مزاج بگڑا ہوا ہو تو بنا سوچے سمجھے وہ لڑکے کو غصّے میں کہتے۔'' بیٹھ جاؤ، سارا دن دو دو، کلاس ختم ہونے کے بعد چلے جانا۔''

اسکول میں انگلش پڑھانے والے ایک ٹیچر گنگا داس کو کم سنائی دیتا تھا۔ اُسے اسکول کی منتظمہ کمیٹی نے کان کی مشین تو مہیا کرادی مگر اس شرط پر کہ ماسٹر جی ہر روز اُسے اسکول لگا کر آئیں گے اور اس کی بیٹری کا خرچہ وہ خود برداشت کریں گے۔ ایک بیٹری مشکل سے دو دن چلتی تھی اور بیس روپے میں آتی تھی۔ مہینے میں تقریباً تین سو روپے بیٹری پر خرچ ہو جاتے تھے۔ گنگا داس کو نو سو روپے تنخواہ ملتی تھی۔ اگر تین سو بیٹری پر خرچ ہو جائیں تو باقی کیا رہا؟ دکھانے کے لیے وہ مشین گلے میں لٹکا کر آجاتے تھے مگر اکثر بیٹری کمزور ہوتی تھی یا ندارد۔ وہ غور سے سنتا ہے یا کم سنتا ہے، لڑکوں کو اس میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ تقریباً ۹۰ فیصدی لڑکوں کو انگریزی ایسے لگتی تھی جیسے انھیں پتّو کاٹ رہے ہوں۔ کلاس میں وہ کتاب پر دھیان دینے کی بجائے چھت کی طرف سر اونچا کر کے اللہ سے التجا کرتے کہ کب چھٹکارا

ملے گا۔

ایک بار ایک لڑکے کو پیشاب کرنے کی حاجت ہوئی۔ حسبِ قاعدہ وہ کھڑا ہو کر ہاتھ کی دو انگلیوں کو اونچا کر کے زور زور سے ہلانے لگا۔ جب ماسٹر جی نے کوئی دھیان نہیں دیا تو وہ ہاتھ اور زور سے ہلانے لگا اور کہنے لگا "ماسٹر جی دو، دو"

اُس دن گنگا داس کی مشین میں بیٹری نہیں تھی۔ اُسے کچھ سنائی نہیں دیا۔ لڑکا بڑا پریشان تھا۔ بغیر اجازت باہر نہیں جا سکتا تھا کیونکہ ایسا کرنا غیر تابعداری مانا جاتا تھا جس کی سزا سنگین ہو سکتی تھی۔ کم از کم بیس کوڑے کی سزا۔ جب لڑکے سے ضبط نہ ہوا تو وہ چلاّیا "ماسٹر جی، دو، دو، دو" ماسٹر جی کو پھر بھی سنائی نہیں دیا۔ جب لڑکے کے پاجامہ سے دو چار بوندیں ٹپکیں تو ساتھ میں بیٹھے ہوئے لڑکے نے اُس کی طرف اشارہ کرتے ہو زور سے ماسٹر جی سے کہا "سر، اُس کا نل ٹپک رہا ہے۔" گنگا داس نے لڑکے سے کہا "جاؤ جلدی آجانا" لڑکے کا پیشاب گاہ تک پہنچتے پہنچتے برتن خالی ہو گیا۔

گنگا داس چھوٹے قد کا تھا۔ کیونکہ وہ کم سنتا تھا، کئی لڑکے اُس کی موجودگی میں اُس کا مذاق اُڑاتے تھے۔ کوئی اُسے ٹھگنا کہتا تو کوئی بونے کے اولاد۔ کوئی اُسے دولت شاہ کا چوہا کہتا اور کوئی آدھا آدمی۔ اگر کوئی بڑے قد والا لڑکا اُس کے پاس کھڑا ہو جاتا تو اُسے ایسے لگتا گنگا داس اُس کا بچہ ہے۔ لڑکوں کو سزا دینے کے لیے وہ ہاتھ میں آبنوس کا کالا کئی فٹ لمبا ڈانڈا رکھتا تھا۔ کبھی ہاتھ پر مارتا تو کبھی لڑکے کے چوتڑوں پر کیونکہ اُسے لڑکے کی چیخ و پکار کم سنائی دیتی تھی۔ وہ کبھی کبھی اپنا ڈنڈا ایسے برساتا جیسے آسمان سے اُولے گر رہے ہوں۔

کلاس میں کوئی چالیس کے قریب لڑکے تھے۔ کیونکہ انگریزی سب کو پڑھنی پڑتی تھی کلاس میں لڑکے زیادہ تھے۔ اس کے علاوہ لڑکے تلفظ کی اتنی غلطیاں کرتے تھے کہ گنگا داس اُن میں اصلاح کرتے کرتے تھک جاتا تھا۔ شاید جتنا لڑکے اُس سے پریشان تھے وہ لڑکوں سے اُتنا ہی پریشان تھا۔ کبھی گالیاں دیتا تو کبھی اُن کو کوستا "گدھے ہیں سب کے سب۔ نہ جانے یہ سؤر کے بچے کہاں سے آجاتے ہیں؟" کلاس میں جیسا کہ ہوتا ہے کئی

لڑکے بڑے قابل تھے۔ وہ اپنا سبق یاد کر کے آتے تھے۔ گھر کے لیے جو کام دیا جاتا تھا وہ بھی کر کے آتے تھے۔ پڑھنے میں کافی دلچسپی لیتے تھے۔ اُن کے والدین کہتے" یہ ماسٹر جی کے ڈنڈے کی برکت ہے، جس نے انھیں قابل اور ہوشیار بنا دیا۔" اُن کے برعکس کئی لڑکے کم عقل آوارہ اور کام چور تھے۔ اُن کو پڑھائی کی طرف کوئی رجحان نہیں تھا۔ مگر ان میں دو چار ایسے چالاک تھے کہ کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے ٹیچر کی مار سے بچ جاتے تھے۔ جو لڑکے اپنے آپ کو لائق سمجھتے تھے وہ آگے بیٹھتے تھے۔ اُن کی آواز آسانی سے ٹیچر کے کانوں تک پہنچ جاتی تھی۔ وہ پچھلی بینچ پر بیٹھنا اپنی لیاقت کی توہین سمجھتے تھے۔ نالائق لڑکے سب سے پچھلی بینچ پر بیٹھتے۔ وہ ٹیچر سے دُور رہنا چاہتے تھے تاکہ ٹیچر سوال نہ کرے اور اگر کرے تو کم سنائی دینے کی وجہ سے اُسے ٹھیک طرح سے غلط جواب سنائی نہ دے۔ ایسے وہ سزا سے بچ جاتے تھے۔

اُن کے آواز اکثر ٹیچر تک پہنچتے پہنچتے اپنا رُخ بدل لیتی تھی یا دھیمی پڑ جاتی تھی۔ اگلی بینچ پر بیٹھے ہوئے ایک لڑکے مکند کو ماسٹر جی نے کتاب کھول کر پڑھنے کے لیے کہا۔ اس نے پانچ دس لائنیں ٹھیک پڑھیں۔ اُس کے بعد اُس کی زبان کی رفتار ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ تلفظ کی غلطیاں کر رہا تھا۔ گنگا داس کو اُس پر غصّہ آیا اور آگے جا کر ایک ڈنڈا اُس کے چوتڑوں پر رسید کیا۔ پھر اُس نے آخری بینچ پر بیٹھے شیر علی کو پڑھنے کے لیے کہا۔ شیر علی بالکل بدھو تھا مگر تھا بڑا اکائیاں۔ ماسٹر جی کی مشین میں بیٹری کا کام کر رہی ہے یا نہیں وہ فوراً جان جاتا تھا۔

شیر علی نے کتاب کھولی اور اٹکل پچو سے پڑھنے لگا۔ کیونکہ گنگا داس دُور بیٹھا تھا اُسے یہ معلوم نہ ہوا کہ شیر علی نے غلط صفحہ کھول رکھا ہے۔ وہ تو اُس کی زبان کی طرف دیکھ رہا تھا کہ چل رہی ہے یا نہیں۔ اگر چل رہی ہے تو کس رفتار سے چل رہی ہے۔ بیچ میں رُک تو نہیں جاتی۔ اپنی آنکھیں کتاب پر جمائے شیر علی بنا کسی رکاوٹ کے بولنے لگا۔ "تو اگر اُستاد ہے تو میں اُستادوں کا اُستاد ہوں۔ تو مجھے کیا سیدھا کرے گا، میں تجھے سیدھا کر دوں گا۔ اسکول میں میری ایسی دھاک ہے کہ اچھے اچھے مجھ سے ڈرتے ہیں۔ اگر تمھارے پاس مشین

میں بیٹری ڈالنے کے لیے پیسے نہیں ہیں تو نوکری چھوڑ دو۔ کلر کی کرلو کسی دفتر میں یا پنساری کی دُکان کھول لو۔ لڑکوں کی طرف پوری توجہ دینا اُستاد کا فرض ہے اور......"

گنگا داس نے شیر علی کی زبان کو کاٹتے ہوئے جماعت کے سبھی طلبا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "دیکھو کیسے فٹا فٹ پڑھتا ہے۔ ایسا لگتا ہے سارا سبق زبانی یاد ہے۔ اس سے کچھ سیکھو۔" سب لڑکے اندر اندر ہنس رہے تھے گنگا داس پھر مکند کے پاس گیا اور ایک بار پھر اُس کے چوتڑوں پر ڈنڈا رسید کرتے ہوئے کہا "دیکھا، تیرا باپ کیسے پڑھتا ہے۔ نکمّا ہے تو نکمّا۔ سارا دن کیا کرتا ہے؟ گلی ڈنڈا کھیلتا ہے یا تاش۔ آوارہ گرد بنے گا۔" اب لڑکے اپنی ہنسی پر ضبط نہ کر سکے۔ گنگا داس نے کہا "بے وقوف لڑکے کچھ کرنے کے بجائے تم ہنس رہے ہو۔ میں تم سب کو سیدھا کر دوں گا۔" اتنے میں گھنٹی بجی۔ سب لڑکے زور زور سے ہنستے ہوئے کمرے سے باہر چلے گئے۔ جان چھوٹی لاکھوں پائے۔

OO

بغیر ٹکٹ سفر

کئی مسافر ایسے ہوتے ہیں کہ جیب میں پیسے ہوتے ہوئے بھی ریل گاڑی کا سفر بغیر ٹکٹ کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ خاص طور پر وہ مسافر جو اپنے دھندے یا مزدوری کے سلسلہ میں روزانہ گاڑی کا سفر کرتے ہیں۔ اُن کے علاوہ بھکاری، لُولے لنگڑے، سادھو سنت، پیر فقیر اور کچھ طالب علم گاڑی کو اپنی ملکیت سمجھتے ہیں۔ بغیر ٹکٹ سفر کرنا اپنے پیشے کا جزوِ لازم سمجھتے ہیں۔ وہ بغیر ٹکٹ سفر کرنے کے داؤ پیچ سے بخوبی واقف ہوتے ہیں یا یوں کہو کہ ماہر ہوتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کب اور کہاں سے اسٹیشن کے اندر بغیر ٹکٹ داخل ہونا ہے اور ٹکٹ چیکر کی نظر بچا کر باہر نکلنا ہے۔ جب گاڑی کے اندر ٹکٹ چیکر کو دیکھتے ہیں یا تو وہ اُٹھ کر بیت الخلا میں گھس جاتے ہیں یا ڈبّے کے اندر ایسے روپوش ہو جاتے ہیں کہ ٹکٹ چیکر کو دکھائی نہیں دیتے۔ اگر ہفتے میں ایک دو بار پکڑے بھی گئے تو کیا ہوا۔ دوگنا کرایہ دے کر بھی مجموعی طور پر فائدے میں رہتے ہیں۔ ایسے بھی ہیں جو اس جھمیلے میں نہیں پڑنا چاہتے اور ٹکٹ بھی نہیں خریدنا چاہتے۔ وہ ایک خاص ڈبے میں بیٹھ کر سفر کرتے ہیں۔ اُن کی ٹکٹ چیکر سے ملی بھگت ہوتی ہے۔ کئی مسافر ایسے ہیں جن کو ناگہانی صورتِ حالات میں ٹکٹ نہیں ملتی حالانکہ ڈبے میں کئی سیٹیں خالی پڑی ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ سب جانتے ہیں کالا دھندا۔ ٹکٹ چیکر بھی ایسے مسافروں کو خداداد عطیہ سمجھتا ہے۔

ایک بار ایک شخص کو تار سے خبر آئی کہ اُس کے والد کی موت ہوگئی ہے۔ اُس کا جانا نہایت ضروری تھا۔ وہ اسٹیشن گیا۔ اُس کو ٹکٹ نہیں ملی۔ اُس نے ایک قلی سے بات کی۔ قلی اُس کا سامان اُٹھا کر پلیٹ فارم پر لے آیا۔ اور اُس کی ملاقات ٹکٹ چیکر سے کروائی۔ چیکر

نے بڑے اطمینان سے کہا ''آپ کسی بھی ڈبّے میں بیٹھ جایئے جہاں آپ کو خالی سیٹ دکھائی دے۔ باقی میں سنبھال لوں گا۔'' پانچ منٹ کے بعد گاڑی چل پڑی۔ مسافر کو فکر ہوئی کہ کوئی اُسے اُٹھا نہ دے۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ اُسے حیرانی ہوئی جب وہ ٹکٹ خریدنے کے لیے گیا تھا کلرک نے کہا تھا ''گاڑی بھر چکی ہے۔ کوئی سیٹ خالی نہیں ہے۔'' مگر اُس نے دیکھا کہ اِردگرد کی کئی سیٹیں خالی پڑی تھیں۔ آدھ گھنٹے کے بعد چیکر آیا اور مسافر سے پوچھا۔ ''کہاں جانا ہے؟'' مسافر نے جواب دیا ''دہلی'' چیکر نے کہا ''ایک سو تیس روپے دے دو جو کرایہ بنتا ہے۔'' چیکر نے رسید بنا کر دے دی۔ جب چیکر رسید کاٹ رہا تھا مسافر نے ڈرتے ڈرتے اپنی جیب سے پچاس روپے کا نوٹ نکالا اور جونہی چیکر نے اُسے ٹکٹ پکڑائی اُس نے نوٹ کو چپکے سے مروڑ کر چیکر کو پکڑا دیا۔ اُسے ڈر تھا کوئی دیکھ نہ لے۔ چیکر نے بِنا دیکھے نوٹ کو جیب میں ڈال لیا۔ مسافر نے آہستہ سے کہا ''پچاس روپے کا ہے۔'' چیکر نے بڑی دلیری سے جواب دیا۔ ''جب آپ نوٹ بٹوے میں سے نکال رہے تھے میری نظر آپ کے بٹوے پر تھی۔'' جب چیکر جانے لگا تو مسافر نے کہا ''شکریہ'' چیکر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ''بھائی صاحب شکریہ کس بات کا۔ آپ کا کام ہو گیا اور میرا بھی۔''

ہر ریل گاڑی میں جس طرح ٹکٹ چیکر ہوتے ہیں ویسے ہی جیب کترے بھی ہوتے ہیں۔ دہلی سے چلنے والی کئی گاڑیاں شاہدرا سے ہو کر جاتی ہیں۔ جیب کترا اور ٹکٹ چیکر ایک دوسرے کو عموماً جانتے ہیں۔ جیب کترا ہر مہینے ایک بندھی ہوئی رقم بطور رشوت چیکر کو دیتا ہے۔ چیکر اُس سے کبھی بھی ٹکٹ کے بارے میں نہیں پوچھتا اور نہ ہی وہ جیب کترا کے کام میں مداخلت کرتا ہے۔ اس نے کس کی جیب کاٹی ہے اُسے اس سے کوئی مطلب نہیں۔ گاڑی جب اسٹیشن سے چلتی ہے، ہر ڈبّے میں کھلبلی رہتی ہے، جب تک مسافر اپنا سامان ٹھکانے نہیں لگا لیتے اور اپنی سیٹوں پر اطمینان سے نہیں بیٹھ جاتے، جیب کترے کے لیے یہ سنہرہ موقع ہوتا ہے۔ کسی نہ کسی کی جیب کاٹ کر جب گاڑی شاہدرا اسٹیشن پر رُکنے کے لیے آہستہ ہوتی ہے تو وہ چلتی گاڑی سے اُتر جاتا ہے اور واپس دہلی چلا جاتا ہے۔ ایک جیب کترا اور ٹکٹ چیکر کے درمیان یہ سلسلہ بڑے آرام سے کافی دیر تک چلتا رہتا ہے۔ ایک دن چیکر

نے جیب کترے سے کہا ''مہنگائی ہوگئی ہے۔ تین سو روپے مہینہ سے کام نہیں چلتا۔ کم سے کم ایک سو بڑھا دو'' جیب کترا کو یہ بات ناگوار گزری۔ اگلے دن ٹکٹ چیکر نے غصّے میں آ کر جیب کترے کو بغیر ٹکٹ سفر کرنے کے جرم میں پولیس کے حوالے کر دیا۔ جیب کترا کافی چالاک تھا۔ پولیس کو رشوت کھلا کر چھوٹ گیا۔ چھوٹنے کے اگلے دن اُس نے ٹکٹ لے کر اُسی گاڑی سے اپنا دھندا پھر شروع کر دیا۔ ٹکٹ چیکر نے اُسے دیکھ لیا۔ مگر وہ سمجھ گیا کہ جیب کترا بغیر ٹکٹ سفر نہیں کر رہا ہے۔ وہ چپ ہو گیا۔ جیب کترے سے ٹکٹ نہیں مانگی۔ جب وہ گھر گیا تو دیکھا جیب خالی تھی۔ سارے دن کی کمائی خاک میں مل گئی۔ وہ سمجھ گیا یہ کام اُسی کا تھا۔ اُس نے فوراً جیب کترے سے سمجھوتہ کر لیا۔ جیب کترے نے اپنی فراخ دلی کا اظہار کرتے ہوئے چُرائی ہوئی رقم واپس ٹکٹ چیکر کو دے دی۔

گھنشیام نام کا ایک آدمی روزانہ سونی پت سے دہلی بغیر ٹکٹ سفر کرتا تھا۔ پُل بنگش پر برف بنانے والی فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ اگر چہ وہ ماہواری پاس کم خرچ پر بنوا سکتا تھا مگر وہ بغیر ٹکٹ سفر کرنے کا عادی بن گیا تھا۔ اُسے اس بات پر ناز تھا کہ وہ روزانہ بغیر ٹکٹ سفر کرتا ہے مگر آج تک پکڑا نہیں گیا۔ کبھی کبھی یار دوستوں کے سامنے شیخی بھی مارتا جیسے اُس نے کوئی قلعہ فتح کر لیا ہو۔ کیونکہ دہلی سبزی منڈی اور سونی پت اسٹیشن کے پلیٹ فارم دونوں طرف سے کُھلے تھے۔ اس لیے اسٹیشن کے اندر گھسنے اور باہر نکلنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی تھی۔ اگر وہ دیکھ لیتا کہ ٹکٹ چیکر ڈبے میں آ گیا ہے تو وہ بڑی پھرتی سے اُٹھ کر دوسرے ڈبے میں چڑھ جاتا۔ وہ اتنا ماہر تھا کہ چلتی گاڑی میں بھی ایک سے دوسرے ڈبے میں چلا جاتا۔ اس کے لیے یہ سرکس کا کھیل تھا۔ ایک دفعہ کسی کام سے اُسے امرتسر جانا پڑا۔ جاتے وقت تو اُس نے ٹکٹ لے لیا مگر آتے وقت سوچنے لگا کہ ٹکٹ لوں یا نہ لوں۔ اتنے میں گاڑی آ گئی۔ وہ ایک ڈبے میں بغیر ٹکٹ کے جا کر سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اتفاق سے وہ ہنومان کا بھگت تھا۔ ہر منگل وار کو بلا ناغہ ماتھے پر تلک لگا کر مورتی کے آگے ماتھا ٹیکتا تھا اور پانچ روپے کا پرشاد چڑھاتا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ ہنومان کا کٹر بھگت ہونے کی وجہ سے اُسے کوئی بھی مائی کا لال بغیر ٹکٹ سفر کرنے سے نہیں روک سکتا۔

گاڑی کے ڈبے میں بیٹھتے ہی گھنشیام نے ہنومان چالیسا دل ہی دل میں پڑھنا شروع کر دیا اگرچہ اُس کا دھیان ٹکٹ چیکر کی طرف تھا۔ اُس نے ہنومان جی کی مورتی کو تصور میں رکھتے ہوئے اپنے آپ سے کہا "اگر میں سونی پت ٹھیک ٹھاک پہنچ جاؤں تو اگلے منگل کو پچاس روپے کا پرشاد بانٹوں گا۔ پرشاد بانٹ کر بھی ایک سو روپے پھر بھی بچ جائیں گے۔"

جب گاڑی جالندھر اسٹیشن پر رُکنے کے بعد اسٹیشن کو پار کر گئی تو وہ سوچنے لگا "گھنشیام، پچاس روپے کا پرشاد بانٹنا بے وقوفی ہے۔ میرے خیال میں چالیس کا کافی رہے گا۔" وہ جانتا تھا کہ اگر وہ بغیر ٹکٹ پکڑا گیا تو پچھلے جنکشن یعنی جالندھر سے دوگنا کرایہ لگے گا۔ جوں جوں وہ آگے بڑھتا جائے گا کرایہ کم ہوتا جائے گا۔ اس لیے پرشاد میں اُس حساب سے کٹوتی صحیح تھی۔ ایسے ہی جب گاڑی لدھیانہ اسٹیشن کو پار کر گئی تو پرشاد چالیس سے پینتیس کا ہو گیا۔ جس رفتار سے گاڑی جا رہی تھی اُسی رفتار سے پرشاد کی قیمت کم ہوتی جاتی۔ انبالہ پار کرنے کے بعد پینتیس سے تیس، کرنال کے بعد پچیس اور پانی پت سے گاڑی چھوٹتے ہی وہ بیس تک آ گیا۔ جب گاڑی ابھی سونی پت اسٹیشن کے سگنل سے باہر تھی اُس نے اپنے دل میں سوچا "اب تو گھر آ گیا ہے۔ میرے خیال میں دس روپے کا پرشاد کافی رہے گا۔ مندر میں پرشاد کھانے والے ہوتے ہی کتنے ہیں۔ زیادہ کھالیں گے تو پیٹ خراب ہو جائے گا۔ بوندی کا پرشاد ویسے بھی بھاری ہوتا ہے۔ زیادہ نہیں کھانا چاہیے۔ اسے بطور رسم اور عقیدت کے ساتھ تھوڑا سا منہ میں ڈال لینا چاہیے۔"

گاڑی سونی پت ریلوے اسٹیشن پر رُکنے والی تھی کہ وہ آہستہ سے پچھلی طرف سے اُتر گیا اور ریلوے لائن کو پار کر کے سونی پت منڈی کی طرف چلا گیا۔ اب بغیر ٹکٹ پکڑے جانے کا خطرہ ٹل گیا تھا۔ اُس نے ہنومان جی کا تہہِ دل سے شکریہ ادا کیا۔ ہنومان چالیسا کو بیگ میں ڈالا اور گھر پہنچ گیا۔ ابھی منگل وار میں تین دن باقی تھے۔

منگل کی شام جب گھنشیام حسبِ معمول ہنومان مندر جانے لگا تو اُسے یاد آیا کہ آج پانچ روپے کی بجائے دس روپے کا پرشاد بانٹنا ہے۔ وہ حلوائی کی دکان پر بوندی لینے کے

لیے گیا تو کچھ بھیڑ تھی۔ اُس کی باری آنے میں پانچ دس منٹ لگ سکتے تھے۔ یہ موقع اُسے پھر سے سوچنے کا مل گیا" یہ ٹھیک ہے میں نے ہنومان جی کو کہا تھا کہ میں پچاس روپے کا پرشاد بانٹوں گا مگر میں نے اپنی حیثیت کو نہ دیکھتے ہوئے جوش میں کہا تھا۔ مجھے کچھ گھبراہٹ بھی تھی جس کی وجہ سے میں ٹھیک طرح سے سوچ بھی نہیں پایا۔ ہنومان جی خود تھوڑا کھاتے ہیں۔ وہ تو گلی محلے کے لوگ ہیں جن میں عموماً بچّے ہوتے ہیں۔ مفت کا مال سمجھ کر کھا جاتے ہیں میرے خیال میں پانچ روپے کا پرشاد کافی ہے۔ ہنومان جی تو اپنے بھگت کی عقیدت مندی کو دیکھتے ہیں نہ کہ پرشاد کو۔ اس میں کوئی شک نہیں میں اُن کا خاص بھگت ہوں۔ وہ پرشاد لے کر کیا کریں گے؟"

OO

بھنگ کا نشہ

بھنگڑو گاؤں میں بھنگ پینے کا رواج کب سے چلا آ رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی تھی کہ پاس کے کھیتوں میں بھنگ کا پودہ لگایا جاتا تھا جس سے کاشت کاروں کو اچھی آمدنی ہو جاتی تھی۔ بھنگ نہ صرف رگڑ کر پینے کے لیے استعمال کی جاتی تھی اس کے کئی طبّی فوائد بھی تھے۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ بھنگ نے لوگوں کو اتنا عادی بنا دیا تھا کہ وہ ہفتے میں کم سے کم دو بار بھنگ ضرور پیتے تھے۔ کیونکہ گاؤں کے اِردگرد کے علاقوں میں پوست اور بھنگ کی کاشت ہوتی تھی شاید اسی لیے گاؤں کا نام بھنگڑو رکھا گیا جس کا مطلب تھا بھنگ رگڑو۔ کیونکہ بھنگ کے پتّوں کو کافی دیر تک رگڑنا پڑتا تھا، لوگوں نے مل کر تین چار دوستوں یا پڑوسیوں کی ٹولیاں بنا رکھی تھیں۔ وہ مل کر بھنگ کو رگڑتے تھے اور ایک ساتھ بیٹھ کر پیتے تھے۔ مالدار اور من مست لوگ بھنگ میں بادام، بادی سے بچنے کے لیے کالی مرچ، چار مغز، خس خس، چھوٹی الائچی اور چینی ڈالتے تھے۔ کئی دودھ بھی ملاتے تھے جس سے بھنگ کا سواد اور بھی اچھا لگتا تھا۔ گرمیوں میں جب وہ اس میں برف ڈال کر پیتے تو پینے والوں کو ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ آبِ حیات پی رہے ہوں۔ جو لوگ بھنگ نہیں پیتے تھے وہ پینے والوں کی نکتہ چینی کرتے تھے۔ مگر پینے والوں کے پاس اس کا گھڑ گھڑایا جواب تھا ''اگر بھولے ناتھ یعنی مہادیو بھنگ پیتے ہیں تو ہمارے پینے میں کیا خرابی ہے۔ اگر وہ بھنگ نہ پئیں تو مردنگ کے ساتھ ناچ نہیں کر سکتے۔''

دُلی چند ڈاکیہ، فقیر داس تیلی، مُنّہ راج آڑھتی اور چیلا رام سبزی فروش نے اپنی ایک

ٹولی بنا رکھی تھی۔ وہ نہ تو ایک دوسرے کے رشتے دار تھے اور نہ ہی پڑوسی۔ ہر اتوار کی شام کو سب پُنہ راج آڑھتی کی دُکان پر بھنگ کا دَور چلانے کے لیے اکٹھے ہو جاتے تھے۔ مہینہ کے آخر میں وہ خرچہ آپس میں بانٹ لیتے تھے۔ بھنگ کے علاوہ اُن میں اور کسی طرح کی رغبت نہیں تھی اور نہ ہی اُن کو کسی دیگر سرگرمی میں کوئی دلچسپی تھی۔ بھنگ رگڑتے وقت وہ اتنے مصروف ہو جاتے کہ کسی اور موضوع جیسے سیاست، مذہب، مہنگائی، اَڑوس پڑوس وغیرہ پر کوئی بات کریں۔ وہ ایک دوسرے کا نام اور پیشہ تو جانتے تھے مگر وہ نہ ایک دوسرے کا گھر اور نہ ہی خاندان کو جانتے تھے۔ جب گھر ہی نہیں جانتے تھے تو ایک دوسرے کے گھر کیسے آتے جاتے۔ اگر کسی وجہ سے کسی کی طبیعت علیل ہو جائے یا وہ نہ آئے تو باقی تین اُس کی کمی تو محسوس کرتے تھے مگر اُس کے گھر پوچھنے نہیں جاتے تھے۔ اُن کی یاری بھنگ پینے تک محدود تھی۔ وہ لکڑی کے ایک گول موٹے دستے سے بھنگ کو موگری میں رگڑتے تھے۔ دستے کے اُوپر انھوں نے چار چھوٹے چھوٹے گھنگرو لگا رکھے تھے۔ جب رگڑنے کے لیے وہ دستے کو گھماتے تو گھنگھروؤں کی آواز ایسی لگتی جیسی پائل کی جھنکار ہو۔ وہ گھنگھروؤں کی موسیقی میں ایسے کھو جاتے کہ اُن کو رگڑنے میں ایک خوشی محسوس ہوتی تھی۔ رگڑتے وقت وہ اُس میں تھوڑا تھوڑا پانی ملاتے رہتے تاکہ سب اَجزا اچھی طرح سے ایک دوسرے کے ساتھ مل جائیں۔ جب رگڑنے کا کام ختم ہو جاتا تو وہ رگڑے ہوئے مواد کو ایک باریک کپڑے سے کسی بڑے برتن میں چھان لیتے اور صحیح مقدار میں پانی یا دودھ ملا لیتے، پھر اپنے اپنے گلاسوں میں ڈال کر گھونٹ گھونٹ کر کے پیتے۔ دھوتی یا قمیض کے پلّو سے وہ ہونٹوں کو ساتھ ساتھ صاف کرتے رہتے۔ اُن کے کھلے ہوئے چہروں کی مسکان سے ایسا ظاہر ہوتا کہ وہ باغِ رضواں کی سیر کر رہے ہوں۔ اتوار کے علاوہ وہ تہواروں جیسے بسنت پنچمی، بیساکھی، لوہڑی، ہولی اور خاص طور پر دیوالی پر تو ایک طرح کا جشن ہوتا تھا جس میں کئی اور لوگ جو کبھی کبھی پیتے تھے وہ بھی شامل ہو جاتے تھے۔

بھنگ پینے کے بعد بھوک بہت لگتی ہے۔ کئی تو عادت سے دو تین گنا زیادہ کھا جاتے ہیں۔ کھا کر کمبھ کرن کی طرح سو جاتے ہیں۔ رات بھر ہوش نہیں رہتا۔ ایک رات دُلی چند

اور اُس کی بیوی چارپائی پر سو رہے تھے۔ چارپائی کچھ چھوٹی تھی۔ جس چارپائی پر وہ اکثر سوتے تھے وہ ٹوٹ گئی تھی۔ ترکھان مرمت کے لیے لے گیا تھا مگر ابھی واپس نہیں دی تھی۔ دونوں کو اُس چھوٹی چارپائی پر اکتفا کرنا پڑا۔ کروٹ بدلتے وقت وہ کئی بار ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے تھے۔ دُلی چند کو سوتے ہی جھٹ نیند آ گئی۔ آدھی رات کے قریب جب اُس نے کروٹ بدلی تو وہ چارپائی سے نیچے گر گیا۔ وہ سویا رہا۔ اس کو کچھ پتہ ہی نہیں چلا۔ اُس کی بیوی بھی گہری نیند میں تھی۔ اُسے بھی کچھ پتہ نہیں چلا۔ شاید اُسے صبح آنکھ کھلنے تک پتہ نہ چلتا اگر چوہے نے دُلی چند کے انگوٹھے کو نہ کاٹ لیا ہوتا۔ اُس کے چلاّنے سے بیوی کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دیکھا کہ چارپائی آدھی خالی ہے۔ اُسے حیرانی ہوئی۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ اُس نے اُٹھ کر بتّی جلائی۔ تب وہ جا کر اپنے شوہر کو ڈھونڈ پائی۔ دُلی چند کا چلاّنا کچھ کم ہو گیا تھا۔ چوہے کے کاٹنے کے باوجود بھنگ کا نشہ ابھی بھی طاری تھا جس نے درد کو کچھ حد تک کم کر دیا تھا۔

اتفاق سے ہولی والے دن پنہ راج کی بیوی اپنے بچوں کو لے کر میکے چلی گئی۔ پنہ راج کو فکر لگی کہ رات کے کھانے کا کیا ہوگا۔ اس کی بیوی کو بھنگ سے بہت نفرت تھی۔ وہ جانتی تھی کہ دیوالی والے دن وہ اتنی پی لے گا کہ اُسے ہوش نہیں رہے گا اور اتنا کھا لے گا کہ روٹی بناتے بناتے اُس کے ہاتھ درد کرنے لگیں گے۔ اُس نے غصّے میں آ کر جانے سے پہلے پنہ راج کے لیے کوئی کھانا نہیں بنایا۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ بھنگ رگڑ کر تو پی لی مگر جب بھوک ستانے لگی تو وہ بہت پریشان ہوا۔ تینوں ساتھیوں نے باری باری سے کہا ''میں چلتا ہوا۔ بھوک لگ رہی ہے'' جب پنہ راج نے کوئی جواب نہیں دیا تو چیلا رام نے کہا ''کیا بات ہے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے۔'' اسی اثنا میں پنہ راج کو ایک ترکیب سوجھی۔ اُس نے کہا ''میری بیوی میکے گئی ہوئی ہے۔ چلو آج رات ہم تھارو رام کے ڈھابے سے کھاتے ہیں۔ ویسے بھی کافی مدت ہو گئی ہے ڈھابے کا کھانا نہیں کھایا۔''

وہ تینوں جلدی رضامند ہو جاتے اگر اُنھیں یہ فکر نہ ہوتی کہ بل کون ادا کرے گا۔ پنہ راج اُن کی شکل کو بھانپ گیا۔ کہنے لگا۔ ''یہ دعوت میری طرف سے ہے۔ سارا بل میں ادا

کروں گا۔ تم بھی کیا یاد رکھو گے کہ تھارو رام کے ڈھابے کا کھانا کھایا تھا۔''

جب وہ لوگ تھارو رام کے ڈھابے پر پہنچے تو وہ دُکان بند کرنے والا تھا۔ عموماً وہ گیارہ بارہ بجے سے پہلے بند نہیں کرتا تھا۔ اُس دن ہولی کی وجہ سے بہت سے گاہک گھر چلے گئے تھے یا بھنگ کے نشے میں مست ہو کر خرّاٹے بھر رہے تھے۔ جب آٹھ بجے تک ایک بھی گاہک نہیں آیا تو اُس نے سوچا دُکان کو سمیٹنا ہی ٹھیک ہوگا۔ ایک دم چار گاہکوں کو دیکھ کر اُس کی باچھیں کھل اُٹھیں۔ اُس نے انھیں بڑے تپاک سے میز کے گرد چار کرسیوں پر بٹھایا اور نوکر سے کہہ کر پانی کے چار گلاس رکھوا دیئے۔ عموماً آرڈر لینے کے لیے اُس کا مینیجر آتا تھا مگر ہولی پر تین ملازم چھٹی لے کر گھر چلے گئے تھے۔ وہ خود اُن سے آرڈر لینے آیا۔ فقیر چند نے پوچھا ''کیا کیا ہے؟'' تھارو نے جواب دیا ''دال مکھنی، پالک پنیر، شاہی آلو، سوکھی گوبھی اور بوندی کا رائتا۔ روٹی آپ جیسی چاہیں مل جائے گی۔ تندور کی یا توے کی، لچھا پراٹھا بھی مل سکتا ہے مگر اُس میں وقت زیادہ لگے گا۔''

انھوں نے چار تھالیاں جن میں سبھی سبزیاں اور رائتا تھا منگوائیں اور لگے کھانے۔ انھوں نے چار تھالیاں اور منگوائیں اور جب چوتھی بار منگوائیں تو ان میں رائتا نہیں تھا۔ رائتا کے بغیر اُن کو کھانا اچھا نہیں لگا۔ تھارو رام نے کہا ''جناب رائتا ختم ہوگیا ہے۔'' پنہ راج نے کہا ''تو بنا لو ہم انتظار کرتے ہیں۔ تھارو رام دہی کہاں سے لاتا۔ رات کے دس بج چکے تھے۔ اس دن باقی حلوائی بھی دُکانیں بند کر کے گھر چلے گئے تھے۔ سبھی مستی میں تھے۔ انھوں نے پھر کہا ''رائتا لے آؤ'' جب تھارو رام نے انھیں یاد دلایا کہ دَہی ختم ہو چکی تھی تو اُن کو یقین نہیں آیا۔ دُلی چند نے کہا ''تو بہانے بنا رہا ہے۔ تو دُکان بند کرنا چاہتا ہے۔ ہم تیری باتوں میں آنے والے نہیں۔'' فقیر چند نے کہا ''اگر تم نے رائتا کا انتظام نہیں کیا تو ہم تیرا سر پھوڑ دیں گے۔'' یہ کہہ کر کہ وہ دہی کا انتظام کرنے جا رہا ہے وہ پیچھے والے کمرے میں جا کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ کیا کروں۔

اتنے میں تھارو رام کا چھوٹا بھائی چونی رام سینما کے رات کا شو دیکھ کر آیا۔ تھارو رام نے اُسے سارا ماجرا سنایا۔ اُس کے بھائی نے پوچھا ''اسٹاک میں میدہ اور بوندی ہیں۔''

تھارو رام نے پوچھا۔ ''وہ تو ہیں مگر میدے کا رائتا تھوڑا بنے گا۔'' چونی نے جواب دیا۔ ''تم فکر مت کرو۔ جلدی کرو۔ میدہ پتیلے میں گھولو۔ بوندی ملاؤ اور حسبِ معمول مسالے خاص طور پر لال مرچ زیادہ ڈالنا۔ سالوں پر بھنگ کا نشہ چڑھا ہوا ہے۔ اُن کو خاک پتہ چلے گا کہ وہ دہی کا رائتا کھا رہے ہیں یا میدے کا۔'' تھارو نے وہی نسخہ اپنایا۔ جب رائتے سے بھری بڑی بڑی کٹوریاں اُن کے سامنے رکھیں تو اُن کی نیم خوابیدہ آنکھیں کھل گئیں۔ روٹی اور سبزی کی طرف زیادہ دھیان نہ دیتے ہوئے وہ لگے رائتا کھانے۔ ایک نے پانچ کٹوریاں کھالیں۔ جب سب کا پیٹ بھر گیا تو پنہ راج نے بل کی ادائیگی کی اور جانے سے پہلے سب نے ایک تال کے ساتھ تھارو رام سے کہا ''تھارو رام، اس میں کوئی شک نہیں کہ تمھارا کھانا اچھا تھا، مگر رائتا کمال کا تھا۔ ایسا لذیذ چٹپٹا رائتا ہم نے پہلے کبھی نہیں کھایا۔ پھر آئیں گے ایک رات۔''

کچھ دنوں کے بعد جب چیلا رام، تھارو رام کی دُکان سے آگے نکل رہا تھا وہ رُک گیا۔ اندر جا کر تھارو رام سے کہنے لگا ''بھائی، اُس رات جو تو نے کھانا کھلایا تھا واقعی بہت اچھا تھا۔ مگر رائتا کمال کا تھا جسے ہم آج تک نہیں بھولے۔''

تھارو رام نے جواب دیا ''آپ کی عنایت ہے۔''

اُن کی بات تھارو رام کا ایک پرانا گاہک سن رہا تھا۔ جب چیلا رام چلا گیا تو اُس نے پوچھا ''تھارو رام، میں تمھارے ڈھابے سے پچھلے آٹھ سال سے کھانا کھاتے آ رہا ہوں اور رائتا ہمیشہ لیتا ہوں۔ مگر اُس آدمی کو تم نے کیسا رائتا کھلایا کہ وہ آج تک نہیں بھولا۔ کبھی ہمیں بھی ایسا رائتا کھلاؤ نا۔''

تھارو رام نے مسکراتے ہوئے کہا ''جناب، یہ آپ کے مطلب کا نہیں ہے۔''

''وہ کیوں؟'' پرانے گاہک نے حیرانی سے پوچھا۔

''جناب، یہ میں نہیں بتا سکتا۔ یہ ہمارا ٹریڈ سیکرٹ یعنی تجارتی راز ہے۔'' تھارو رام نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

OO

بھینگا

نین سُکھ ایک قابل لڑکا تھا۔ پڑھائی میں کافی دلچسپی رکھتا تھا۔ اپنی جماعت میں تقریباً اوّل درجے پر آتا تھا۔ اسکول کے سبھی ماسٹر اُس کے کام سے خوش تھے۔ ماں باپ کے لیے وہ نورِ چشم تھا۔ اسکول میں روز کسی نہ کسی لڑکے کو غلطی پر کلاس میں مار پڑتی تھی۔ نین سکھ ابھی تک سزا سے بچا ہوا تھا۔ کئی لڑکے اُس سے خار کھاتے تھے۔ کوئی کہتا ”نہ جانے کس گائے کا دودھ پیتا ہے کہ اس کا دماغ وادیٔ گل کی طرح ہمیشہ تروتازہ رہتا ہے۔“ دوسرا کہتا ”لگتا ہے اس کا باپ اسے گرم دودھ میں بادام روغن ملا کر پلاتا ہے۔ پیسے والا لگتا ہے۔ ہمارا باپ تو دو وقت کا دودھ نہیں دے سکتا۔“

چھوٹی عمر سے ہی اُسے وقت کی قیمت کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ گلی کے دوسرے لڑکوں کی طرح نہ تو آوارہ گردی کرنے کا شوقین تھا اور نہ ہی گھر سے باہر جا کر گھنٹوں گلی ڈنڈا کھیلتا تھا۔ ایک دن جب اسکول سے چھٹی کے بعد وہ گھر جا رہا تھا تو راستے میں کچھ لڑکے گلّی ڈنڈا کھیل رہے تھے۔ جس لڑکے کے ہاتھ میں ڈنڈا تھا اُس نے اتنے زور سے ٹُل مارا یعنی گلّی کو اُوپر اُچھالا کہ گلی کا ایک کونہ بندوق سے نکلی گولی کی طرح سیدھا نین سکھ کی داہنی آنکھ میں جا لگا۔ وہ چلّانے لگا۔ اُس کی آنکھ سے خون بہنے لگا۔ سب لڑکے گلّی ڈنڈا چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ایک راہ گیر نے نین سکھ کو سنبھالا اور اُسے اسپتال لے گیا۔ اتنے میں اس کے گھر والے بھی آ گئے۔ ڈاکٹر نے اُسے ایمرجنسی میں داخل کیا اور کچھ ٹیسٹ کرنے کے بعد اُس کی آنکھ کا آپریشن کرنے کے لیے وہ اُسے آپریشن گاہ میں لے گئے۔ تین ڈاکٹروں نے مل کر

اُس کا آپریشن کیا۔ بدقسمتی سے دو گھنٹے کی متواتر محنت اور کوشش کے باوجود وہ نین سکھ کی آنکھ کو نہیں بچا سکے۔ اُسی کی آنکھ کا ڈھیلا چور چور ہو گیا تھا جس کو ٹانکے لگا کر جوڑنا لگ بھگ ناممکن تھا۔ نین سکھ ہمیشہ کے لیے دائیں آنکھ سے بھینگا ہو گیا۔

دو چار مہربانوں نے صلاح دی کہ نین سکھ کو بڑے اسپتال میں لے جاؤ۔ مگر یہ اتنا آسان نہیں تھا۔ ایک تو اسپتال وہاں سے ساٹھ میل دُور تھا اور دوسرا نین سکھ کے باپ کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ وہ آنے جانے کا خرچ، رہنے اور کھانے پینے کا خرچ اور اس کے علاوہ اسپتال میں رہنے، دائیوں کا خرچ اور ڈاکٹروں کی فیس وغیرہ دے سکے۔ وہ امیر نہیں تھا جیسا کہ لڑکے سمجھتے تھے۔ وہ ایک چھوٹی سی ٹرانسپورٹ کمپنی میں منشی تھا۔ نین سکھ کو ایک آنکھ پر اکتفا کرنا پڑا۔ اسی گہما گہمی میں دو مہینے گزر گئے۔ گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد جب اسکول کھلا تو نین سکھ نے اسکول جانے سے انکار کر دیا۔ وہ بار بار یہی کہتا ''لڑکے مجھے چھیڑیں گے اور مجھے ایک آنکھ سے ٹھیک بھی نہیں دکھائی دے گا۔''

باپ نے اُسے سمجھایا ''بیٹا، ایسی بات نہیں ہے۔ دو چار دن لڑکے چھیڑیں گے پھر آہستہ آہستہ چھیڑنا بند کر دیں گے۔ مگر ایک بات کا خیال رکھنا جب تمھیں کوئی لڑکا چھیڑے تم چپ کر جانا۔ سُنی اَن سُنی کر دینا۔ جھگڑا مت کرنا۔ اگر کسی کو جواب دو گے یا غصّہ کرو گے وہ تمھیں زیادہ چھیڑیں گے۔''

کیونکہ یہ حادثہ گرمیوں کی چھٹیوں کے شروع میں ہوا تھا بہت سے لڑکوں کو اس کا علم ہی نہیں تھا کہ نین سکھ کی ایک آنکھ چلی گئی ہے۔ لڑکے لڑکے ہیں، وہ چھیڑنے سے باز نہیں آتے۔ کوئی اسے بھینگا کہتا کوئی کانا۔ کوئی داغی پھل یا جوالی گیہوں کہتا۔ ایک لڑکے نے من گھڑت بات کہی ''جب رات کو سو رہا تھا کوئی چوہا اس کی آنکھ کی پتلی کو پنیر کا ٹکڑا سمجھ کر لے گیا۔'' دوسرا کہتا ''کسی لڑکی کو آنکھ ماری ہوگی۔ آنکھ ایسی ماری کہ لڑکی آنکھ لے کر چمپت ہو گئی۔'' تیسرا ہمدردی دکھاتے ہوئے کہنے لگا۔ ''بچارے کو کسی کی نظر لگ گئی ہے۔''

اُن کی باتیں سن کر نین سُکھ کبھی ہنس پڑتا تو کبھی تنگ ہوتا۔ ایک نٹ کھٹ لڑکے نے اُسے تجویز دی۔ ''یار، تمھیں ایک صلاح دوں۔ کسی ایسی لڑکی سے شادی کرنا جو بائیں آنکھ سے

بھینگی ہو، جب دونوں ساتھ ساتھ چلو گے تو سامنے کا پورا منظر دکھائی دے گا۔ کسی سے راستے پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔'' ایک اور شریر لڑکے نے کہا'' بھیا، نین سُکھ اب تم اپنا نام بدل ڈالو۔ دکھائی تو پورا دیتا نہیں اور نام ہے نین سکھ۔ کیوں کیا خیال ہے؟''

اتنی باتیں سن کر نین سُکھ نہ صرف اس کا عادی ہو گیا تھا بلکہ حاضر جواب بھی۔ ایک لڑکے نے اپنی دو انگلیاں اوپر کر کے پوچھا'' نین سُکھ، کتنی انگلیاں ہیں؟'' نین نے مسکراتے ہوئے جواب دیا'' آئینہ میں جا کر دیکھ لو۔ مجھ سے کیوں پوچھتے ہو؟ لگتا ہے تیری ایک انگلی کٹ گئی ہے۔ تجھے یقین نہیں آ رہا تبھی تو مجھ سے پوچھ رہا ہے۔ میں بتاؤں تیری ایک انگلی ہے۔ ایک آنکھ سے تو میں ایک ہی دیکھ سکتا ہوں۔''

دیکھتے ہی دیکھتے وہ بڑا ہو گیا۔ اسکول سے نکلوا کر باپ نے اُس کی نوکری اپنی ٹرانسپورٹ کمپنی میں بطور کلرک لگوا دی۔ پہلے تو مالک کو شک ہوا کہ ایک آنکھ سے کتنا کام کرے گا۔ وہ رکھنا تو نہیں چاہتا تھا مگر چین سُکھ کی پرانی نوکری کا لحاظ کرتے ہوئے اُسے رکھ لیا۔ مالک نے نین سُکھ کو اپنے ایک محاسب کے ساتھ لگا دیا۔ اُس کا خیال تھا کہ ٹھیک نہ دیکھنے کی وجہ سے وہ ضرور غلطیاں کرے گا جس سے اُسے کمپنی سے برخاست کرنے کا بہانہ مل جائے گا۔

نین سُکھ کافی ہوشیار ہو گیا تھا۔ جب وہ محاسب کے پاس حاضری دینے کے لیے گیا تو اُس کی ایک آنکھ دیکھ کر اُس نے مشکوک ہو کر پوچھا'' تمھاری ایک آنکھ ہے۔ تم کیا حساب کتاب رکھو گے۔ بار بار غلطیاں کرو گے۔ میرا کام اور بھی بڑھ جائے گا۔'' جب وہ ٹیلی فون اٹھا کر مالک کو کرنے لگا تو نین سُکھ نے اعتماد کے ساتھ کہا'' سر، اگر مہاراجہ رنجیت سنگھ ایک آنکھ سے حکومت کر سکتے تھے تو میں کیا یہ معمولی سا بہی کھاتا بھی نہیں سنبھال سکتا۔ ایک آنکھ چلی گئی ہے تو کیا ہوا۔ دوسری تو صحیح سلامت ہے۔ اگر ارادہ پکّا ہو تو ایک نابینا بھی اپنا راستہ خود ڈھونڈ سکتا ہے۔''

محاسب کو اُس کی بات بھا گئی۔ بغیر کسی حجت کے اُس نے نین سُکھ کو رکھ لیا۔ دفتر میں اُس کے ساتھی اُس کا اتنا مذاق نہیں اُڑاتے تھے جتنا اسکول میں اس کے ہم جولی اُڑاتے

تھے۔ اس کے باوجود کئی لوگ حیران ہوتے تھے کہ جتنا کام ہم دو آنکھیں ہوتے ہوئے کرتے ہیں وہ ایک آنکھ سے کرلیتا ہے۔ ایک دفعہ ایک رفیق کار نے پوچھا ''نین سُکھ ایک بات بتا۔ تو جتنا کام ایک آنکھ سے کرلیتا ہے ہم دو آنکھوں سے نہیں کرسکتے۔ کوئی تو وجہ ہوگی؟''

اس سے پہلے کہ نین سُکھ کوئی جواب دیتا دوسرے رفیق کار نے کہا ''تو بھی ایک آنکھ کی پتلی نکلوا کر دیکھ لے۔ عملی تجربہ ہو جائے گا۔ اپنی آنکھ کسی اندھے کو دان کردے۔ ایک پنتھ دو کاج۔ کیوں کیا خیال ہے۔ ایک بات اور بھی ہے پھر نین سُکھ کی طرح تیری ترقی اور بھی جلدی ہو جائے گی کیونکہ تیری عقل بڑھ جائے گی۔''

نین سُکھ نے مذاق میں پوچھا ''سنتوش، یہ بتا تُو میری کتنی آنکھیں دیکھ سکتا ہے؟''

سنتوش نے جھٹ جواب دیا ''ایک'' نین سکھ نے ہنستے ہوئے جواب دیا ''میں تیری دو دیکھ سکتا ہوں۔ اب بتا کون زیادہ دیکھ سکتا ہے؟ ایک آنکھ والا یا دو آنکھ والا۔''

ایک دفعہ نین سُکھ کے پرانے دوست گمبھیر پرشاد نے اُس سے کہا ''یار، کتنے سالوں سے تُو اس چھوٹے سے شہر میں پڑا ہے۔ تو نے کبھی بڑا شہر جیسے دہلی، بمبئی یا لکھنؤ دیکھا ہے۔ پہلے بھی میں تمھیں دو تین بار صلاح دے چکا ہوں۔ ایک دن میرے ساتھ چلو تم کو لکھنؤ دکھادوں۔ دنگ رہ جاؤ گے۔ یہاں سے صبح آٹھ بجے بس پکڑیں گے اور شام کو اندھیرا ہونے سے پہلے گھر لوٹ آئیں گے۔ صرف ستر میل ہی تو ہے لکھنؤ۔''

نین سُکھ بھینگا ہونے کی وجہ سے ڈرتا تھا کہ کہیں شہر میں لوگ اُس کا مذاق تو نہیں اُڑائیں گے۔ چاہے اُس کا یہ خوف بے بنیاد تھا مگر اس بار اُس کا دل مچل گیا۔ پھر بھی اُس نے کہا ''سوچ کر بتاؤں گا۔'' گمبھیر نے کہا ''اس میں سوچنے کی کیا بات ہے۔ کوئی خاص تیاری تھوڑی کرنی ہے۔ ہم نے وہاں رہنا نہیں۔ بس جانا اور آنا۔ چل پرسوں چلتے ہیں۔ چھٹی ہے۔'' نین سکھ مان گیا۔

اتوار کو نین سُکھ اور گمبھیر نے صبح چھ بجے کی پہلی بس پکڑی۔ کیونکہ اتوار کا دن تھا سڑک پر اتنی آمد و رفت نہیں تھی۔ وہ نو بجے لکھنؤ پہنچ گئے۔ گمبھیر نے اپنے یار کو لکھنؤ کے دو تین تاریخی

مقام دکھائے اور بارہ بجے ڈھابہ سے کھانا کھایا۔ اس کے بعد انھوں نے ایک پارک میں تھوڑی دیر آرام کیا۔ گمبھیر نے کہا۔ ''چل، اب میں تجھے یہاں کا بڑا بازار دکھاتا ہوں۔'' جب وہ بازار میں داخل ہوئے تو اتنی چہل پہل اور بھیڑ دیکھ کر نین سُکھ گھبرا گیا۔ اپنے چھوٹے سے شہر سے باہر نکلنے کا اُس کے لیے یہ پہلا موقع تھا۔ اتنے سال ایک جگہ پڑے پڑے دراصل وہ بھول گیا تھا کہ دنیا بڑی وسیع ہے۔ بازار میں دونوں طرف کی دُکانیں سامان سے بھری پڑی تھیں اور ایسے سجی ہوئی تھیں جیسے بارات کے استقبال کے لیے برات گھر۔ اُنھیں دیکھ کر نین سُکھ حیران رہ گیا۔ وہ بڑا آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ کئی دُکانوں کے اندر جھانک کر دیکھنے کے لیے وہ رُک جاتا تھا۔ گمبھیر نے کہا ''یار، جیسے تو رُک رُک کر چل رہا ہے، بہت دیر لگ جائے گی۔ بس نکل گئی تو کیا کریں گے؟ یہاں رات کو کہاں رہیں گے۔'' بس اڈّے پر آ کر انھوں نے پانچ بجے کی آخری بس پکڑی۔ بس میں بیٹھے بیٹھے وہ باتیں کرتے رہے۔

گمبھیر نے پوچھا ''کیسا لگا لکھنؤ کا بازار؟''

نین سُکھ نے جواب دیا ''واقعی ایسا بازار میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ اچھا ہوا تُو مجھے یہاں لے آیا۔''

''اچھا ہوا تمھیں اچھا لگا نہیں تو مجھے کوستا رہتا۔'' گمبھیر نے کہا۔

نین سُکھ نے سنجیدگی سے کہا ''مگر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ جب ہم بازار کے اندر داخل ہوئے تو میرے دائیں طرف کی سب دُکانیں تھیں اور جب ہم واپس آئے تو بائیں طرف کی بند تھیں۔ بڑا عجیب شہر ہے۔''

OO

اتوار والا بھیّا

دور الا گاؤں میں رہنے والا رام سنگھ کاریگر وہاں سے کوئی چار میل دور سائیکل بنانے والی فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ سائیکلوں کی گدّیاں لگانے میں اُس کی مہارت تھی۔ پچھلے آٹھ سال سے وہ اس فیکٹری میں کام کر رہا تھا۔ چھوٹی سی فیکٹری ہونے کی وجہ سے اُس کی تنخواہ واجب تھی، مگر اتنی آمدنی نہیں تھی کہ وہ گھر اور بچوں کا خرچ نکال کر کوئی بچت کر سکے۔ جب بھی موقع ملتا زائد وقت لگا کر آمدنی میں کچھ نہ کچھ اضافہ کر لیتا۔ اپنی بیوی بلّو اور چار چھوٹے چھوٹے بچّے جن کی عمر علیٰ الترتیب ایک، تین، پانچ اور سات برس تھی۔ وہ ایک طرح سے اُس کے لیے مالی بوجھ تھے۔ کرپال سب سے بڑا تھا۔ وہ اسکول جاتا تھا۔ باقی بچّے ماں کو سارا دن پریشان کرتے تھے۔ پانچ سال والے کو اسکول بھیج سکتے تھے مگر آمدنی محدود ہونے کی وجہ سے اُس کے اسکول کا خرچ برداشت کرنا ایک مشکل بات تھی جس کا حل ابھی تک اُنھیں نہیں ملا تھا۔ رام سنگھ فیکٹری کے لیے صبح آٹھ بجے گھر سے نکل جاتا تھا اور رات کو گھر لوٹتے لوٹتے آٹھ سے اوپر ہو جاتے تھے۔ اگرچہ اُس کے پاس سائیکل تھی مگر گاؤں سے فیکٹری کا راستہ کچا ہونے کی وجہ سے اُسے ایک گھنٹہ سے زیادہ لگ جاتا تھا۔

صبح جلدی تیار ہونے کی وجہ سے رام سنگھ کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا تھا کہ وہ بچوں سے کوئی بات چیت کرے۔ حقیقت یہ تھی کہ کرپال کو چھوڑ کر باقی تین تقریباً سو رہے ہوتے تھے۔ رات کو جب وہ واپس گھر آتا تب بھی کرپال کو چھوڑ کر باقی تین عموماً سو رہے ہوتے تھے، کیونکہ وہ بچوں کے لیے کوئی تحفہ لاتا تھا اور نہ کبھی جیب خرچ دیتا تھا۔ وہ بھی اُس سے بات

کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ بچوں کو شاید یہ علم بھی نہیں تھا کہ وہ اُن کا باپ ہے۔ رام سنگھ کے پاس سارا دن فیکٹری میں کام کر کے اتنی ہمّت اور وقت نہیں بچتا تھا کہ وہ بچوں کے ساتھ بیٹھ کر کچھ وقت گزارے۔ وہ اپنی بیوی کو کبھی کبھی کہتا "میں تھک کر اتنا چوُر ہو جاتا ہوں کہ اپنے بچّے بھی اچھے نہیں لگتے۔"

پندرہ اگست، چھبیس جنوری، دو اکتوبر، دیوالی، ہولی اور دسہرہ کے علاوہ ہفتے میں فیکٹری صرف اتوار کو بند رہتی تھی۔ ایک دفعہ فیکٹری کے مالک کا باپ مر گیا۔ اس نے ایک دن کے لیے فیکٹری بند کروادی۔ جہاں مالک کے لیے ماتم کا دن تھا کاریگروں کے لیے خوشی کا۔ ایک کاریگر اپنے مالک کے بارے میں کہنے لگا "سالے کا ایک ہی باپ تھا۔ دو چار ہوتے تو پھر چھٹی ہو جاتی۔" دوسرے نے سر ہلا کر کہا۔ "واقعی، جیسے بچّے کئی ہوتے ہیں ویسے باپ بھی کئی ہونے چاہئیں خاص طور پر اپنے مالک کے۔"

اتوار کے دن رام سنگھ کا کافی وقت اپنے کیس دھونے، سکھانے اور تیل لگانے میں لگ جاتا۔ شام کو بچوں کو گھر چھوڑ کر وہ بیوی کے ساتھ ایک گھنٹے کے لیے گوردوارے چلا جاتا۔ بچوں کو صرف اتنا محسوس ہوتا کہ اتوار کو گھر میں پانچ افراد کی جگہ چھ ہوتے ہیں۔ اگر کسی کی شادی پر جانا پڑتا جو عموماً سکھوں میں دن کے وقت ہوتی ہے یا کسی نزدیکی رشتے دار کی موت ہو جائے تو رام سنگھ کو چھٹّی لینے میں بہت کوفت ہوتی تھی کیونکہ اُس دن کی تنخواہ کٹ جاتی تھی۔

ایک دن اسکول میں کرپال کا کسی لڑکے سے جھگڑا ہو گیا۔ کرپال نے اُسے اتنے زور سے پیٹا کہ اُسے دو چار چوٹیں آئیں۔ اُس نے اسکول میں جا کر ہیڈ ماسٹر سے شکایت کی۔ ہیڈ ماسٹر نے کرپال کو اپنے کمرے میں بلا کر پہلے تو اپنے بید سے اُس کے چوتڑوں پر خوب مارا اور پھر کہا "روز تو کسی نہ کسی سے جھگڑا کرتا ہے۔ کل اپنے باپ کو ساتھ لے کر آنا۔"

وہ گھر جا کر اپنی ماں سے پوچھنے لگا "میرا باپ کون ہے؟"

ماں نے غصّے سے جواب دیا "بے شرم کہیں کا۔ تو اپنے باپ کو بھی نہیں جانتا۔"

کرپال خاموش ہو گیا۔ جب ماں کا غصّہ ٹھنڈا ہوا تو وہ اپنے آپ کو کوسنے لگی۔ "اس میں کرپال کا کیا قصور؟ شادی کے دو سال تک جب میں اپنے سے گھونگھٹ کرتی تھی مجھے

بھی کبھی کبھی اپنے شوہر کو پہچاننے میں غلطی ہو جاتی تھی۔ کئی بار جب اُس نے مجھے ہاتھ لگایا تو میں جھجکی تھی کہ وہ میرا مرد ہے یا کوئی غیر مرد۔ لالٹین کی روشنی میں صاف بھی تو نہیں دِکھائی دیتا تھا۔

جب ماں نے کوئی جواب نہیں دیا تو کرپال نے کہا ''ماں، کیا بات ہے؟ میرے پتا جی زندہ تو ہیں؟'' اب ماں سے نہ رہا گیا اور اُس نے زور سے ایک تھپڑ اُس کے گال پر مارا اور ایک بار پھر غصّے میں کہنے لگی۔ ''تو کیا اَنٹ شنٹ کہہ رہا ہے۔ واہی گورو کا نام لے۔ ایسے منحوس الفاظ پھر منہ سے نہ نکالنا۔''

ماں نے پھر بھی رام سنگھ کا تعارف کرپال سے نہیں کرایا۔ اُسے ڈر تھا کہ اگر وہ کرپال کو باپ کی پہچان کرواتی ہے تو نہ صرف یہ عجیب لگے گا بلکہ ایسا بھی ہو سکتا ہے وہ کسی اسکول کے ہم جماعت یا محلے کے لڑکے کو دانستہ کہہ دے ''میں آج پہلی بار اپنے باپ سے ملا ہوں'' تو بات سارے محلے میں کیا سارے شہر میں پھیل جائے گی۔ لوگ ہنسی اُڑائیں گے اور کئی طرح کی باتیں بنائیں گے۔

سردیوں کی ایک سہ پہر باہر آنگن میں محلے کی کچھ عورتیں دُھوپ سیک رہی تھیں اور ساتھ ساتھ گپّیں ہانک رہی تھیں۔ ایک عورت نے مذاق میں بلّو سے پوچھا۔ ''تیرا گھر والا دکھائی نہیں دیتا کہیں تجھے چھوڑ کر تو نہیں چلا گیا؟''

بلّو کو طیش آ گیا۔ آنکھیں دکھاتے ہوئے کہنے لگی ''کیوں؟ تو کیوں پوچھ رہی ہے؟ تیرا کیا لگتا ہے؟ تیری کوئی اُس سے پرانی یاری تو نہیں؟''

پڑوسن بڑی حاضر جواب تھی۔ کہنے لگی ''میرا تو کچھ نہیں لگتا، کسی کا تو لگتا ہے جو سارا دن غائب رہتا ہے اور رات کو بہت دیر سے گھر لوٹتا ہے جب سب سو رہے ہوتے ہیں۔'' بلّو بڑبڑانے لگی۔

ایک اور عورت نے کہا ''چھوڑنا، ہرنام، ہمیں کیا لینا وہ کیا کرتا ہے۔ جب اُس کی بیوی کو فکر نہیں تو کیوں ناحق نکتہ چینی کرتی ہے۔ تو اپنے شوہر کو سنبھال کر رکھ۔''

گفتگو مسالے دار ہو گئی۔ سب عورتیں گول گپوں جیسا سواد لے رہی تھی اور ہنس بھی رہی تھیں۔ ایک اور عورت بول اُٹھی ''مرد کا کیا؟ کھاتا گھر پر ہے سوتا باہر ہے۔''

ایک دن فیکٹری میں جب رام سنگھ سائیکل کی گدّی لگا رہا تھا اچانک اُس کے پیٹ میں درد ہوا۔ وہ چلاّنے لگا۔ نزدیک میں کوئی شفا خانہ نہیں تھا۔ ایک کاریگر بھاگتا ہوا گیا اور منیم کو اطلاع دی۔ منیم نے کہا ''فوری امداد والا ڈبّہ لے آؤ۔'' جب ڈبّہ کو کھولا تو اُس کے اندر پُرانی دوائیاں تھیں۔ اُن میں سے کئی کی آخری تاریخ ختم ہوگئی تھی۔ ساتھ میں کھڑے یونین کے لیڈر نے کہا ''میری جیب میں چورن کی گولیاں ہیں۔ ان کو کھانے سے اس کا پیٹ درد ٹھیک ہو جائے گا۔ شاید بدہضمی کی وجہ سے پیٹ خراب ہوا ہے۔''

ایک کاریگر بولا ''بچارے کو اتنی تنخواہ ملتی ہے جس سے گھر کا گزارہ مشکل سے ہوتا ہے۔ بدہضمی کہاں سے ہو جائے گی۔''

رام سنگھ نے چار گولیاں کھائیں۔ کچھ آرام ہوگیا۔ اُس نے اپنے مالک سے کہا ''آپ کی اجازت ہو تو تھوڑا آرام کرلوں۔''

مالک سوچنے لگا۔ اگر لیٹے لیٹے اس کے پیٹ میں پھر درد شروع ہوگیا تو مجبوراً اسے شفا خانے لے جانا پڑے گا جس کا خرچ فیکٹری پر پڑے گا۔ اُس نے اپنی ہمدردی جتاتے ہوئے کہا ''رام سنگھ، ایسا کرو تم گھر چلے جاؤ۔ جو آرام گھر میں ملے گا وہ فیکٹری میں نہیں مل سکتا۔''

جب رام سنگھ جانے لگا تو مالک نے کہا ''کل ٹھیک وقت پر آ جانا۔ کام بہت پڑا ہے۔'' رام سنگھ نے اپنی سائیکل اُٹھائی اور گھر کو چل پڑا۔ راستے میں اُس کو پھر درد ہوا۔ مگر قے آنے سے اُس کا پیٹ کافی ہلکا ہوگیا۔ جب وہ گھر پہنچا تو کوئی چار بجے تھے۔ اُس نے سائیکل آنگن میں کھڑی کر دی، گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اُس وقت بلّو لیٹی ہوئی تھی۔ کھٹکھٹاہٹ سن کر اُس نے کرپال کو کہا ''بیٹا کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ جا تُو دیکھ کون ہے؟'' کرپال چارپائی سے اُٹھ کر گیا اور دروازہ کھولا۔ اُس نے جب رام سنگھ کو دیکھا تو اُسے حیرانی ہوئی۔ اُسے کچھ غلطی ہوئی۔ وہ کوئی اجنبی تھا یا وہی آدمی جو اتوار کو گھر میں دکھائی دیتا تھا۔ وہ اُس سے کچھ پوچھنے لگا۔ اُدھر سے ماں نے چارپائی پر لیٹے لیٹے آواز لگائی ''بیٹا، کون آیا ہے؟'' کرپال نے جھٹ زور سے جواب دیا تاکہ اُس کی ماں سُن سکے۔ ''ماں، اتوار والا بھیّا آیا ہے۔''

OO

جھوٹوں کا اُستاد

لوگ کہتے ہیں جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ دروغ گو جھوٹ کے کتنے بھی مضبوط پُل باندھ لے کبھی نہ کبھی وہ شکنجے میں آ ہی جاتا ہے۔ مگر کالے خان کا لڑکا یوسف ہمیشہ بچ جاتا۔ اُس کا دماغ بڑا تیز تھا۔ عین وقت پر اُسے کچھ نہ کچھ جھوٹ سوجھ جاتا۔ سننے والے کو رتی بھر بھی شک نہیں ہوتا کہ وہ ہوا پر گرہ لگا رہا ہے۔ بچپن سے ہی وہ جھوٹ بولنے کا عادی ہو گیا تھا۔ اپنی زبان کی تیز قینچی سے وہ کسی کے اعتماد کو پل بھر میں کاٹ سکتا تھا۔ اسکول میں اُس کی جماعت کے تقریباً سب لڑکے جانتے تھے کہ وہ کبھی بھی صحیح بات نہیں کہتا۔ اُس سے سچ اُگلوانا آسمان سے تارے توڑ کر لانا تھا۔ اُس کی قدرتی مسکراہٹ، چہرے کی معصومیت اور حلیمی اُس کے جھوٹ پر ایک طرح سے نقاب ڈالے ہوئے تھی جس سے اندر کا پتہ لگانا جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔ اسکول کے کام کو وہ ہاتھ نہیں لگاتا تھا۔ اگر ماسٹر جی پوچھیں تو منہ بنا کر کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دیتا تھا۔ اگر ماسٹر جی اُس کو مارنے لگتے تو رونی صورت بنا کر کہتا ''ماسٹر جی، اِس بار معاف کر دیجیے۔ میں قرآن پاک کی قسم کھا کر کہتا ہوں آئندہ ایسی کوتاہی نہیں ہوگی۔ میں اپنا ہوم ورک پورا کر کے آؤں گا۔''

یوسف نے سعید نام کے ایک لڑکے کو اپنا دوست بنا رکھا تھا۔ وہ اُس کی کاپی سے ہو بہو نقل کر لیتا۔ ایک دفعہ سعید نے کہا ''یار یہ ٹھیک نہیں ہے۔ جھوٹ بولنا ایک بہت بڑا گناہ ہے۔ قیامت کے دن تو خود بھی رگڑا جائے گا اور مجھے بھی ناحق پسوائے گا۔''

یوسف نے جواب دیا ''بس۔ اللہ سے معافی مانگ لوں گا۔ تیرے لیے بھی اور اپنے لیے بھی۔ خدا مہربان ہے۔''

سعید نے پوچھا ''تو اپنا کام خود کیوں نہیں کرتا؟''

یوسف نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ''پچھلے کئی سالوں سے نہیں کر رہا ہوں۔ اب خاک کروں گا۔''

سعید نے ایک اور سوال کیا ''بڑا ہو کر کیا کرے گا؟''

یوسف نے ہنستے ہوئے سیدھا کورا جواب دیا ''بڑا ہو کر بڑے جھوٹ بولوں گا جھوٹا لپاٹی۔'' پھر کہنے لگا ''سعید تمھیں ایک بات کہوں، لوگ کہتے ہیں جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ میں کہتا ہوں سچ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ سچ بولو تو کسی کو یقین نہیں آتا۔ جھوٹ کو چالاکی اور بناوٹی سنجیدگی سے کہو تو لوگ جھٹ مان جاتے ہیں۔''

گھر میں اُس کے والدین بھی اُس سے تنگ تھے۔ ہر بات کا من گھڑت یا اُلٹا پلٹا جواب دیتا تھا۔ ایک شام کالے خان گھر سے باہر جانے کے لیے کپڑے بدل رہا تھا۔ اُس نے یوسف سے کہا۔ ''عزیز دیکھ باہر بارش تو نہیں ہو رہی۔''

اُس نے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے جواب دیا۔ ''ابو نہیں تو۔''

کالے خان نے کہا ''تو باہر تو گیا نہیں تجھے کیسے معلوم؟''

یوسف نے بڑے اطمینان سے جواب دیا'' ابھی ابھی ایک بلّی باہر سے اندر آئی تھی۔ میں نے اُسے ہاتھ لگا کر دیکھا۔ بالکل سوکھی ہوئی تھی۔'' ایک دن ایسے ہی عید کے موقع پر اس کی امّی نے ایک بڑے سے برتن میں میٹھی سوئیاں ڈال کر کہا ''یوسف، جا اسے اپنی بُوا کے گھر دے آ۔'' راستے میں وہ ساری سوئیاں چٹ کر گیا۔

ایک گھنٹے کے بعد جب وہ واپس آیا تو ماں نے پوچھا ''دے آیا بیٹا، وہاں سب ٹھیک ہیں نا؟''

یوسف رونی شکل بنا کر کہنے لگا ''ماں، کیا بتاؤں۔ جب میں بوا کے گھر جا رہا تھا، ایک

کتّا میرے اُوپر لپکا۔ ڈونگا میرے ہاتھ سے گر گیا اور اُس کا ڈھکن کھل گیا۔ کتّا پھٹا پھٹ ساری سوئیاں کھا گیا''

ماں کو غصہ آ گیا۔ ماں نے کہا ''خالی ڈونگا کہاں ہے؟''

یوسف نے منہ بناتے ہوئے جواب دیا ''امّی، وہ کتّا اٹھا کر لے گیا۔ دور جا کر اندر سے چاٹنے لگا۔ ڈونگا اس کی گردن میں پھنس گیا۔ میں اُسے کیسے نکالتا۔ مجھے تو ویسے بھی کتّے سے ڈر لگ رہا تھا۔ بڑا لمبا چوڑا تھا۔''

ماں نے کہا ''نہ جانے تو کب سیکھے گا۔''

یوسف نے ماں کی بات کو کاٹتے ہوئے کہا ''ماں، کیا کتّے بھی عید مناتے ہیں؟''

کئی بار کسی لڑکے سے چھٹی کی درخواست لکھوا دیتا اور باپ کے جعلی دستخط کر کے اسکول بجھوا دیتا۔ درخواست میں کبھی بیماری کی وجہ تو کبھی ضروری کام۔ ایک دفعہ ماسٹر جی کو شک ہوا۔ انھوں نے کالے خان کو اسکول بلایا اور ایک درخواست دکھا کر کہا ''کیا یہ آپ نے لکھی تھی؟''

کالے خان نے جب وہ درخواست دیکھی تو ہکّا بکّا رہ گیا۔ اب وہ کیا جواب دیتا۔ ماسٹر نے کہا ''شاید آپ کو معلوم نہیں آپ کا صاحبزادہ ایسی کئی درخواستیں ماضی میں بھجوا چکا ہے۔ اس پر نظر رکھیے گا۔ بڑا چالو ہے۔ ایک دن آپ کے کان کترے گا۔''

کالے خان بہت شرمندہ ہوا اور ماسٹر کو یقین دلایا کہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ گھر جا کر اُس نے یوسف کو بہت ڈانٹا اور اُس کے گال پر دو چپت بھی رسید کیے۔ یوسف نے بناوٹی آنسو دِکھاتے ہوئے کہا ''ابو، میں نے تو عرضی لکھی تھی آپ کے دستخط کی مشق کے لیے۔ میں نے سوچا کبھی آپ بیمار پڑ جائیں یا دو چار دن کے لیے گھر سے باہر چلے جائیں تو ضرورت پڑنے پر آپ کے دستخط کر سکوں۔''

کالے خان اپنے لڑکے کی من گھڑت کہانیاں اور اسکول سے ٹیچروں کی لگاتار شکایتیں سن کر تنگ آ گیا تھا۔ کالے خان نے یوسف کو ہمیشہ کے لیے اسکول سے نکلوا دیا۔

کپڑوں کی سلائی کرنے کا کام سیکھنے کے لیے اُسے ایک درزی کی دُکان پر بٹھا دیا۔ جب وہ کام سیکھ گیا تو اُسی محلے میں ایک چھوٹی سی دُکان لے لی اور کپڑے سینے یا مرمت کرنے کے لیے اُسے دُکان پر بٹھا دیا۔

یوسف کا کام کرنے میں دل نہیں لگتا تھا۔ اُس نے کبھی کام کرنا سیکھا ہی نہیں تھا۔ کسی نہ کسی طرح سے وہ چھوٹے موٹے کپڑے سی لیتا یا مرمت کر دیتا۔ مگر جیسے اُس کی عادت تھی دو جھوٹ بول کر گاہک کو اکثر ایک دو بار تو ٹال دیتا تھا۔ کبھی بھی وقت پر سلا ہوا کپڑا نہیں دیتا تھا۔ اُس کی دروغ گوئی اور لاپرواہی کو دیکھتے ہوئے کالے خان نے ایک درزی کو تنخواہ پر یوسف کے ساتھ دُکان پر بٹھا دیا۔ ایک تو وہ کپڑے سینے میں اُس کی مدد کرتا تھا اور دوسرا کالے خان کی ہدایت پر وہ یوسف کے کام پر نظر رکھتا تھا۔ کالے خان کے لیے مشکل یہ تھی اگر وہ دُکان بند کروا دے تو یوسف کو کہاں رکھے۔ سارا دن آوارہ گردی کرے گا اور اپنی ماں کو تنگ کرے گا۔ ایک بار جو گاہک اُس سے کپڑا سلوا لیتا وہ دوبارہ اُس کی دکان پر نہیں آتا۔

جب یوسف اُنیس کا ہوا، کالے خان نے اُس کی شادی کر دی۔ اُس کی بیوی آمنہ کو کافی دیر تک سمجھ نہیں آئی کہ یوسف جھوٹ کیوں بولتا ہے۔ اُس نے دو چار بار اپنے شوہر سے پوچھا بھی "آپ جھوٹ کیوں بولتے ہیں؟ روزمرّہ زندگی میں تھوڑا بہت جھوٹ تو چلتا ہے مگر اتنا نہیں جتنا آپ بولتے ہیں۔ میرے خیال میں سچ بولنے سے آپ کو دماغی کوفت ہوتی ہے۔" یوسف نے آمنہ کی بات کا بُرا نہیں مانا۔ اُس نے جواب دیا "تو تو پگلی ہے۔ میں نے ساری زندگی سچ نہیں بولا اب تم سے بولوں گا۔"

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ سمجھ گئی کہ یوسف کے والدین اُس کی دروغ گوئی سے اتنا ہی تنگ اور پریشان ہیں جتنا وہ ہے۔

مگر آمنہ کو ایک ڈر تھا کہ کہیں کسی غیر آدمی کے سامنے یوسف یہ نہ کہہ دے کہ آمنہ اُس کی بیوی نہیں ہے۔ خوش قسمتی سے یوسف نے ایسا جھوٹ کبھی نہیں بولا۔ وقت گزرتا گیا۔ اُس کے دو بچے بھی ہو گئے لیکن یوسف کی دروغ گوئی کی وسعت اور شدت میں کوئی فرق نہیں

آیا۔ دروغ گوئی اُس کا تکیہ کلام بن چکی تھی۔ بال سفید ہو گئے لیکن زبان سیاہ کی سیاہ رہی۔ باسٹھ سال کی عمر میں اُس کی موت ہو گئی۔ جیسے کہ خدائے کریم کا بنایا ہوا اصول ہے کہ مرنے کے بعد یوسف کو خدا کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ اس سے پہلے اُسے کفارہ خانہ میں رکھا گیا۔ جب وہ زمین پر تھا تو اُس نے پڑھ رکھا تھا کہ مرنے کے بعد ہر انسان کو خدا کے سامنے پیش ہونا پڑتا ہے۔ جہاں مختصر شنوائی کے بعد خدا اپنا فیصلہ سناتا ہے کہ کس کو بہشت میں بھیجا جائے، کس کو دوزخ میں۔ مگر کسی بھی گنہگار یا پاکباز کے ساتھ ناانصافی نہ ہو۔ اُس کو موقع دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہے تو بنا روک ٹوک یا خوف کے کہہ سکتا ہے۔ کیونکہ خدا کے پاس شنوائی کے لیے زیادہ وقت نہیں ہوتا۔ اُس نے دو فرشتے نکیر اور منکر مقرر کر رکھے ہیں جو کفارہ خانہ میں جا کر نظر بند سے پوچھ تاچھ کرتے ہیں جس کا خلاصہ خدا کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔

کفارہ خانہ میں جیسے ہی نکیر گیا اُس کو دیکھتے ہی یوسف کھڑا ہو گیا اور جھک کر بڑے احترام کے ساتھ سلام کیا۔ پھر کہا ''میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

نکیر نے کہا ''تم مسلمان ہو کر ساری زندگی جھوٹ بولتے رہے۔ کوئی نیک کام بھی کیا؟''

یوسف نے جھٹ بے تکلفی سے جواب دیا ''حضور، آپ فرشتہ ہیں، میں ایک معمولی سا انسان تھا۔ میرے بارے میں یا تو آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے یا کسی نے آپ کو میرے خلاف بھڑکایا ہے۔ میں ایک نیک آدمی تھا۔ زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں بولا اور آپ کہتے ہیں کہ......''

نکیر نے ٹوکتے ہوئے کہا ''تمھیں اپنی صفائی میں کچھ مزید کہنا ہے۔''

یوسف نے بنا ہچکچاہٹ کے جواب دیا ''حضور، جب آپ نے اپنے کھاتے میں اندراج کر ہی لیا ہے کہ میں جھوٹا آدمی ہوں تو میرے صفائی دینے یا نہ دینے سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا ہے۔ آپ نے یہاں تشریف لانے کی خواہ مخواہ تکلیف کی۔'' نکیر یہ سن کر

چلا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد کفارہ خانے میں منکر گیا۔ اُس کو دیکھتے ہی یوسف کھڑا ہو گیا اور بڑے ادب کے ساتھ جھک کر سلام کیا جیسے اُس نے نکیر کے ساتھ کیا تھا۔ اس نے کہا ''حضور، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

منکر نے کہا'' زمین پر ہمارے کارندے گاہے بگاہے ہمیں اطلاع دیتے رہے کہ تم نے ساری زندگی جھوٹ بول کر گزار دی۔ خدا کے سامنے پیش کرنے سے پہلے تمھیں اگر اپنی صفائی میں کچھ کہنا ہے تو بغیر کسی جھجک یا خوف کے کہہ سکتے ہو۔ تمھارے ساتھ انصاف ہوگا۔

یوسف نے بے دھڑک ہو کر جواب دیا۔'' آپ نے یہاں آنے کی خواہ مخواہ زحمت اُٹھائی۔ ابھی ابھی تو نکیر صاحب پوچھ کر گئے ہیں۔ میں نے اُن کو سب کچھ صاف صاف خدا کو حاضر ناظر کر کے بتا دیا ہے۔ میں سو فیصد سچ کہہ رہا ہوں کہ میں نے اپنی زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں بولا اس سے زیادہ مجھے کچھ نہیں کہنا ہے۔'' منکر اُس کی بات سن کر چلا گیا۔

رات کو لیٹے لیٹے یوسف کو اچانک خیال آیا کہ کرۂ ارض پر ہر روز لاکھوں کی تعداد جن میں اکثریت مسلمانوں کی ہے اپنا مال و متاع چھوڑ کر فرشتۂ اجل کے غلام بن کر ہمیشہ کے لیے چلے جاتے ہیں۔ ان سب کی ایک ہی خدا کیسے شنوائی کر سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے ہندوستان میں جیسے بڑی عدالت سے لے کر چھوٹی چھوٹی کئی عدالتیں ہوتی ہیں اسی طرح خدا کی دنیا میں بھی کئی عدالتیں ہوں گی۔ شاید اُس کو کسی چھوٹی معمولی سی عدالت میں پیش کیا جائے گا۔ لیکن جہاں ہندوستان میں سینکڑوں مقدمے سالوں سالوں چلتے رہتے ہیں یا پڑے پڑے اُن پر دھول جمع ہو جاتی ہے۔ کیا خدا کے ہاں بھی ایسا ہی ہوتا ہے؟ پھر اُس کو خیال آیا کہ آج کل کمپیوٹر سے کام ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے خدا کے پاس کوئی سپر کمپیوٹر ہے جس کے ذریعے مقدمہ کی جلدی جلدی کارروائی ختم ہو جاتی ہے۔ اور شاید فیصلہ بھی کمپیوٹر لکھتا ہے۔ سوچتے سوچتے اُسے نیند آ گئی۔

اگلے دن یوسف کو کائنات کے شہنشاہ خدا کے دربار عظیم میں لایا گیا۔ مگر اُسے خداوند کریم

دِکھائی نہیں دیا۔ کسی کونے سے ایک ہلکی سی آواز آئی ''یوسف کو پیش کیا جائے''۔

کیونکہ یوسف کو خدا نہیں دکھائی دیا اُس نے جھک کر سلام نہیں کیا۔ خدا نے باری باری سے نکیر اور منکر کو بلایا۔ نکیر نے کہا ''میں اس کے پاس گیا تھا۔ اس نے مجھے کہا ابھی ابھی منکر صاحب سب احوال لکھ کر لے گئے ہیں۔ آپ نے آنے کی تکلیف کیوں کی۔'' جب منکر سے پوچھا گیا تو اُس نے بھی وہی جواب دیا ''میں اس کے پاس گیا تھا۔ اس نے مجھے کہا ابھی ابھی نکیر صاحب آئے تھے۔ میں نے اُن کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ آپ نے آنے کی تکلیف کیوں کی؟'' خدا نے غصّے میں کہا ''تم مسلمان ہو کر خدا کے سامنے بھی جھوٹ بولتے ہو۔ تمھیں سیدھا....'' یوسف نے خدا کی بات کو کاٹتے ہوئے کہا ''اے خداوند کریم! میں جھوٹ نہیں بولتا۔ حقیقت میں آپ کے دو فرشتے جھوٹ بول رہے ہیں۔ ان میں سے میرے پاس کوئی بھی نہیں آیا تھا۔''

OO

منسٹر صاحب

جب بھارت ایکتا سیاسی پارٹی کے صدر اور وزیر اعظم کی طرف سے رام دیو ڈھولکی والے ممبر پارلیمنٹ کو نائب وزیر مقرر کرنے کی مبارک باد کا پیغام صبح صبح قاصد اُس کے گھر لے کر آیا تو خاندان کے سارے اراکین کی باچھیں کھل اُٹھیں۔ گھر میں ڈھولک تو تھی نہیں چاہے رام دیو کا خاندانی نام ڈھولکی والا تھا۔ وہ تھالیوں اور خالی تانبے کی برتنوں کو بیلنا، کڑچھی اور چمٹے سے بجاتے ہوئے ناچنے لگے۔ رام دیو کی چناؤ میں یہ تیسری جیت تھی۔ ہر بار وہ وزارت کی کرسی کے لیے دعا کرتا مگر اُس کی بدقسمتی گدی کسی اور کو مل جاتی۔ اس بار اُس نے پورا زور اور رسوخ لڑایا اور اپنے ارادے میں کامیاب ہوگیا۔ اُس کے دفتر کے لیے ایک علاحدہ کمرہ آراستہ کیا گیا۔ نجی سیکریٹری اور چپراسی کے علاوہ پانچ کارکن بطور عملہ دیئے گئے۔ چارج لینے کے بعد وہ سب سے پہلے وزیر اعظم کو ملا اور پھر پارٹی کے صدر کو۔ اُس نے دونوں کا تہہِ دل سے شکریہ ادا کیا۔ اب وہ انتظار کرنے لگا کہ اُسے وزارت کا کون سا محکمہ دیا جائے گا۔ چار دن کے بعد جب وزیر اعظم نے اُسے فون کیا کہ اُسے کوئلے کی کھانوں کا محکمہ دیا جارہا ہے پہلے تو اُسے کچھ اُداسی ہوئی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ کوئلوں کی دلالی میں منہ کالا ہوتا ہے۔ پھر ایکدم اسے خیال آیا کہ کوئلوں کی کھانوں کی نیلامی ہوتی ہے یا کوئلہ نکالنے کا ٹھیکہ دیا جاتا ہے، تو وہ خوشی سے اُچھل اُٹھا۔ جہاں کھان سے کوئلہ نکلتا تھا وہاں وزیر صاحب کے لیے ساتھ سونا نکلتا تھا۔ چھ مہینے میں تو رام دیو کے وارے نیارے

ہو گئے۔ تین چناؤ میں جو خرچ کیا تھا وہ پورا ہو گیا اور منافع شروع ہو گیا۔

وزیر رام دیو کو جہاں ایک طرف لالچ تھا دوسری طرف وزارت میں اپنا سکہ جمانے کے لیے وہ اپنے کام میں ایسے جٹ گیا کہ دفتر میں دیر تک بیٹھا رہتا اور سرکاری افسروں سے کوئلہ کے موضوع پر کافی بحث ہوتی۔ اپنی وفاداری اور جان نثاری کا ثبوت دینے کے لیے وہ اپنے خاص عملے کے ساتھ کانوں کے دورے پر گاہے بگاہے جانے لگا۔ کوئلہ کی گرد سے اُس کا منہ کالا ہو جاتا اور کچھ گرد ناک سے گھس کر پھیپھڑوں کے اندر چلی جاتی جو صحت کے لیے نقصان دہ تھی، مگر اُس نے پرواہ نہیں کی۔ نوٹوں کے بنڈل دیکھ کر اس کی کھانسی رُک جاتی اور دل کی حرکت اپنے صحیح مقام پر آ کر آرام کرتی۔ گاہے بگاہے وہ وزیر اعظم کو سلام کرنے کے لیے نوٹوں سے بھری ہوئی اٹیچی لے کر اُن کے گھر چلا جاتا۔ جو مسرّت وزیر اعظم کو نوٹوں کے بنڈلوں کو دیکھ کر ہوتی اُتنی رام دیو کے کام سے نہیں۔ کام تو چلتا رہتا ہے، مگر نوٹوں کے بنڈل ہمیشہ چل کر نہیں آتے۔

رام دیو کا ڈھولکی والا خاندانی نام کیوں تھا؟ اس کے پیچھے ایک قصہ ہے جو بے بنیاد نہیں لگتا۔ تین چار پشتیں پہلے رام دیو کے بزرگوار شادی بیاہ اور خاص موقعوں پر ڈھولک بجاتے تھے۔ کافی ہنر مند تھے۔ اُن کی اگلی پشت نے اپنے باپ دادا کی شہرت کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے ڈھولک بنانے کا ایک چھوٹا سا کارخانہ کھولا۔ کام چل پڑا۔ کافی پیسہ کمایا۔ اُن کے جانشینوں نے اپنے بزرگوں کی دولت کو نہیں چھوڑا مگر ڈھولک بجانے اور بنانے کا کام چھوڑ دیا۔ دولت کے پیشِ نظر اُن کو ڈھولک بجانے کا کام گھٹیا قسم کا لگتا تھا۔ کیونکہ اپنے بزرگوں کی محنت مشقت سے اُنھیں کافی پونجی وراثت میں ملی تھی۔ انھوں نے اُن کی یاد میں خاندانی نام نہیں بدلا۔ رام دیو کا والد کرشن مراری ڈھولکی والا کافی ہوشیار اور چالاک آدمی تھا۔ وہ سیاست میں گھس گیا۔ چار چناؤ لڑے، جس میں تین ہار گیا۔ ریکارڈ خراب ہونے کی وجہ سے پارٹی نے اُسے وزارت کی کرسی کے قابل نہیں سمجھا۔ اتنے میں رام دیو بڑا ہو گیا تھا۔ اُس نے ہمیشہ کہا کہ ایک دن وہ وزیر بن کر دِکھائے گا۔ چھوٹی عمر میں کافی تگڑم باز اور

حاضر جواب تھا۔ اسکول کے بچوں کو پیٹتا تھا۔ استاد اس سے ڈرتے تھے۔ وہ اُس کی شکایت ہیڈ ماسٹر سے نہیں کرتے تھے۔ لڑکیوں کو کھلے بازار چھیڑتا تھا۔ شراب پیتا تھا اور ایسا سننے میں آیا کہ وہ مجرا سننے کے لیے کچھ امیر خاندانوں کے شہزادوں کے ساتھ کوٹھے پر جاتا تھا۔ اُس میں وہ سبھی چیزیں تھیں جو ایک سیاستداں میں ہونی چاہیے۔ اپنے مضبوط پٹھوں، دھڑے بازی اور باپ کے پیسے کے زور سے لوگوں میں کافی مشہور ہو گیا۔ اُن کو سبز باغ دِکھا کر وہ پہلا چناؤ ہی کافی ووٹوں سے جیت گیا۔ پارٹی اس کی مقبولیت کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے اسے وزارت میں جگہ جلدی سے مل گئی۔ شروع شروع میں اُس کے ساتھی اُس کے معصوم چہرے اور حلیمی کو دیکھ کر اُسے سیدھا سادا اور ایماندار سمجھتے تھے۔ مگر وقت کے ساتھ انھیں اپنی رائے بدلنی پڑی۔ گھوس خوری کی فہرست میں اب اُس کا نام کافی اوپر آ گیا تھا۔

رام دیو نے دیکھا کہ کئی منسٹر ملک سے باہر دورے پر جاتے ہیں۔ اُسے ابھی تک کوئی موقع نہیں ملا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ باہر جانے کے لیے کوئی اسکیم بنانی پڑتی ہے جس کی منظوری وزیر اعظم دیتا ہے۔ جب اُس نے اپنے نجی سیکریٹری رام بل سے بات کی تو اُس نے کہا: ''جناب، مجھے دو چار دن دیجیے، میں کوئی نہ کوئی اسکیم بنا لوں گا۔''

رام بل، رام دیو کے ساتھ کام کرنے سے پہلے کئی وزیروں کے ساتھ کام کر چکا تھا۔ اُن کے ساتھ کئی ممالک کی سیر بھی کر آیا تھا۔ تین دن کے اندر اپنا دماغ لڑا کر اُس نے ایک اسکیم بنائی۔ جو مشین سونے کی کھانوں سے سونا نکالنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے اگر وہی مشین کوئلہ نکالنے کے لیے استعمال کی جائے تو کام بڑی تیزی سے ہو سکتا ہے۔ اس لیے جنوبی افریقہ کا دورہ مناسب رہے گا اور ملک کی بہبودی کے لیے کارآمد ثابت ہوگا۔ رام بل کی اسکیم منسٹر کو اچھی لگی۔ وہ خود فائل لے کر وزیر اعظم کے دفتر میں اس کی منظوری لینے کے لیے گیا۔ وزیر اعظم نے فائل کو سرسری طور سے دیکھا اور بنا کسی حیل و حجت کے دستخط کر دیئے۔ دراصل وزیر اعظم کے دماغ کے پیچھے رام دیو کی دودھ سے ملائی اُتارنے کی ترکیب گھوم رہی تھی جو اُنھیں کافی اچھی لگی تھی۔

جس پچھلی رات کو ہوائی جہاز کی اُڑان ہونی تھی، رام دیو نے اپنی بیوی کو کہا: ’’مجھے بتایا گیا ہے کہ دہلی سے جنوبی افریقہ کے سفر میں دس گھنٹے لگ جائیں گے۔ میں کھانا کھا کر جاؤں گا۔ راستے کے لیے مجھے چار پراٹھے اور آلو گوبھی کی سبزی ڈبے میں ڈال کر دے دینا۔‘‘

رام دیو کا یہ پہلا ہوائی سفر تھا۔ اُسے کچھ ڈر لگ رہا تھا۔ رام بل نے تسلی کراتے ہوئے کہا: ’’جناب، گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ میں ہوں نا آپ کے ساتھ۔‘‘

جہاز کے اُڑان کے کوئی بیس منٹ بعد جب مسافروں کو کھانا دیا جا رہا تھا، اچانک رام دیو کی نظر پڑ گئی۔ اس نے رام بل سے پوچھا: ’’یہ کیا ہے؟‘‘

رام بل نے جواب دیا: ’’جناب، یہ کھانا ہے جو جہاز میں ہر مسافر کو دیا جاتا ہے۔ اِس کا سب خرچ ٹکٹ میں جڑا ہوا ہے۔ ہمیں کچھ نہیں دینا پڑے گا۔‘‘

یہ سن کر رام دیو کو غصہ آ گیا۔ ’’بے وقوف، تو نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ میں گھر سے کھا کر نہ آتا۔‘‘

رام بل نے ڈرتے ہوئے کہا: ’’حضور، میں نے سوچا آپ جانتے ہوں گے۔‘‘

رام دیو نے کہا: ’’مگر اُس کھانے کا کیا ہوگا جو میں ساتھ لایا ہوں۔‘‘

رام بل کو حیرانی ہوئی۔ اُس نے جواب دیا: ’’جناب، اسے ہم ساتھ نہیں لے جا سکتے۔ جنوبی افریقہ کے ہوائی اڈّے پر اگر کسٹم والوں کی نظر پڑ گئی تو وہ نہ صرف اسے کوڑے دان میں پھینک دیں گے بلکہ اندر اندر ہماری ہنسی اُڑائیں گے۔‘‘

رام دیو نے کہا: ’’تو میں اسے کھا لیتا ہوں۔‘‘

رام بل نے کہا: ’’جناب، ہم گھر سے لایا ہوا کھانا یہاں نہیں کھا سکتے۔ آپ فکر مت کیجیے۔ میں اسے تھیلے میں رکھ کر بیت الخلا لے جاؤں گا اور فلش میں بہا دوں گا۔‘‘

رام دیو کو پھر غصہ آیا۔ ’’بیوقوف، میری بیوی نے کتنی محنت اور محبت سے پراٹھے بنائے ہیں اور تو کہتا ہے کہ اُنھیں پاخانے کی طرح فلش میں ڈال دیں گے۔‘‘

رام بل نے گھبراتے ہوئے کہا: ''جناب، اور کوئی چارہ نہیں۔ ہم اسے ہوائی جہاز میں بھی نہیں چھوڑ سکتے۔ میڈم کو بتانے کی کیا ضرورت ہے؟''

رام دیو نے حیرانی سے پوچھا: ''یہ میڈم کون ہے؟''

رام بل نے جواب دیا: ''جناب، آپ کی شریمتی جی۔ ہندوستان سے باہر بیوی کو باہر کے لوگ میڈم کہہ کے پکارتے ہیں۔''

ساؤتھ افریقہ کے ہوائی اڈّے پر جہاز رُکنے کے فوراً بعد جونہی منسٹر نے اپنے قدم ایئرپورٹ کی آرام گاہ میں رکھے سرکار کی طرف سے استقبالیہ آداب و رسوم کے مطابق اُن کی عزت افزائی کی گئی اور اُنھیں دیگر اراکین کے ساتھ ہوٹل لے جایا گیا۔ ہوائی اڈّے پر اخبار کے ایک نمائندہ نے پوچھا: ''یور ایکسیلینسی، آپ تو محکمہ کوئلہ کے وزیر ہیں، آپ یہاں سونے کی کھانیں دیکھنے کے لیے کیوں آئے ہیں؟''

رام دیو اَن پڑھ تو نہیں تھا مگر اسکول کے دنوں سے اس کی انگریزی بہت کمزور تھی۔ وزارت میں اپنے محکمہ کی مدد سے سرکاری کام کو چلا لیتا تھا۔ اُس کو نمائندہ کا تلفظ سمجھ میں نہیں آیا۔ مگر کوئی نہ کوئی جواب دینا ضروری تھا۔ رام بل سے اُس سوال کا ترجمہ کروا کر جواب دینا اپنی توہین کروانی تھی۔ اس نے اندازہ لگایا کہ نمائندہ اُن سے پوچھ رہا ہے کہ آپ ساؤتھ افریقہ کیسے آئے۔ اُس نے جواب دیا: ''سنا ہے سیاحت کے لیے آپ کا ملک بہت خوبصورت ہے۔ اس لیے ہم نے سب سے پہلے اسے چنا۔''

ایک ہفتہ کے بعد جب رام دیو جنوبی افریقہ کا دورہ پورا کر کے ہندوستان لوٹا تو دہلی ہوائی اڈّے پر اُس کے استقبال کے لیے اُن کے مُرید اور خوشامدی لوگ ہاتھوں میں پھولوں کے ہار لیے اُس کے آنے کا بے صبری سے انتظار کر رہے تھے۔ اتنے لوگوں اور رنگ برنگے پھولوں کے ہار اور گلدستے دیکھ کر رام دیو کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی اور سفر کی تھکان کو وہ عارضی طور پر بھول گیا۔ چلنے سے پہلے رام بل نے آگاہ کیا تھا: ''جناب، جب ہم دہلی ہوائی

اڈّے کے باہر آئیں گے تو اخباروں کے نمائندے آپ سے یہ سوال ضرور کریں گے کہ کوئلہ کی کھانوں اور سونے کی کھانوں میں کیا رشتہ ہے کہ آپ جنوبی افریقہ دورہ پر سونے کی کھانوں کو دیکھنے کے لیے گئے۔ اگر آپ کہیں تو میں اس کا جواب بنا دوں۔''

رام دیو نے خود اعتمادی کے ساتھ جواب دیا: ''رام بل، گھبراؤ نہیں، میں سنبھال لوں گا۔''

جب دہلی ہوائی اڈّے کے باہر اخبار کے نمائندے نے سب سے پہلے یہی سوال کیا تو وزیر صاحب بوکھلا گئے۔ نمائندہ کو ٹالنا ممکن نہیں تھا۔ اگر ایسا کیا تو صبح کے سبھی اخباروں میں بڑی بڑی سرخی کے ساتھ یہ خبر چھپ جائے گی کہ رام دیو بد دماغ اور کھوکھلا وزیر ہے۔ رام دیو نے رام بل کو نزدیک بلا کر کہا: ''ان اخبار والوں کو کہو کہ وزیر صاحب تھکے ہوئے ہیں۔ دو تین دن کے اندر وہ اپنے دفتر پر ایک پریس میٹنگ بلائیں گے، تب آپ جو سوال کریں گے اُس کا وہ تسلی بخش جواب دیں گے۔'' بغیر نمائندوں کی طرف نظر ڈالے رام دیو سیدھا اپنی گاڑی میں جا کر بیٹھ گیا اور شوفر کو کہا: ''چلو، گھر چلو۔'' راستے میں رام بل سے کہا: ''یہ اخبار والے اُلٹے پلٹے فضول کے سوال کرتے ہیں۔ کیا ہم ان کا منہ بند نہیں کر سکتے؟''

رام بل نے جواب دیا: ''جناب، ان کے منہ تو کیا بند ہوں گے، ہمارے ہو جائیں گے۔ ان سے پنگا لینا تو وہی بات ہے آ بیل مجھے مار۔''

رام دیو نے پوچھا: ''کیا مطلب؟''

رام بل نے صحیح جواب دیا: ''جناب، آپ جنتا کے نمائندے ہیں۔ اخبار جنتا کے ترجمان ہیں۔ پہلے تو ہم پریس پر کوئی روک ٹوک نہیں لگا سکتے۔ اگر ہم نے کوشش بھی کی تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ جمہوریت ختم ہو جائے گی۔ آپ کی کرسی آپ سے چھن جائے گی۔'' رام دیو چپ کر گیا۔ اتنے میں اُس کا گھر آ گیا۔

رام دیو کے سالگرام پریم پال نے اپنے ذاتی مفاد کے لیے اپنے جیجا جی کی حرکتوں پر نظر رکھی ہوئی تھی۔ وہ اپنی بہن سے باتوں باتوں میں رام دیو کی سرگرمیوں کے بارے میں کافی جانکاری حاصل کر چکا تھا۔ جب رام دیو گھر آیا، پریم پال پہلے ہی موجود تھا چاہے اُس

وقت رات کے تین بجے تھے۔ کیونکہ رام دیو تھکا ہوا تھا۔ کپڑے بدل کر سو گیا۔ صبح دفتر جانا تھا۔ پریم اپنے گھر نہیں گیا۔ ناشتے کی میز کے گرد وہ پہلے سے ہی آ کر بیٹھ گیا تھا، جو رام دیو کو اچھا نہیں لگا۔ مگر بیوی کے سامنے اُسے وہ کچھ کہنے سے کتراتا تھا۔ جب وہ ناشتہ کر رہے تھے اچانک پریم نے اپنے جیجا جی کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا: ''جیجا جی، میں نے تو سن رکھا ہے کوئلوں کی دلالی میں منہ کالا ہوتا ہے، مگر آپ کے چہرے پر تو نکھار آ گیا ہے۔''

رام دیو کو اپنے سالگرام کا تبصرہ بہت بیہودہ اور طیش دلانے والا لگا۔ مزے کی بات تھی کہ اس کی بیوی نے اپنے بھائی کو کچھ نہیں کہا، اُلٹا ہنسنے لگی۔ ایک بار تو اُس کو خیال آیا کہ پریم کو اس کی بدتمیزی کے لیے دو تھپڑ لگا کر گھر سے باہر نکال دے مگر اس کی بہن کے سامنے وہ اپنے غصّے کو ناشتے کے ساتھ چائے سمجھ کر پی گیا۔

OO

ندرا دیوی

جب پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کے دن دہلی کے لال قلعہ سے برطانوی سرکار کا یونین جیک اُتار کر کے ہندوستان کی آزادی کا پرچم لہرایا جا رہا تھا ٹھیک اُسی وقت گردھر گوپال پاشی اپنی جان بچا کر سرگودھا سے گاڑی کے ایک ڈبے میں گم سم بیٹھا اُس وقت کا بے صبری سے انتظار کر رہا تھا جب وہ اپنا قدم آزاد ہندوستان کی سرزمین پر رکھے گا۔ سرگودھا سے لاہور جو گاڑی عموماً چار پانچ گھنٹے لگاتی تھی وہی گاڑی راستے میں دمہ کے مریض کی طرح کئی جگہ رُک رُک کر کیڑے کی طرح رینگتی ہوئی پندرہ گھنٹوں میں سرحد پہنچی۔ اُس وقت پاشی اٹھائیس برس کا تھا۔ اُس کی بیوی اور تین چھوٹے بچے پاشی کے سسرال والوں کے ساتھ کچھ دن پہلے ہجرت کر کے ہندوستان آ گئے تھے۔ عارضی طور پر اُنھیں جالندھر کیمپ میں رکھا گیا۔ پاشی کو اُن کے بارے میں کوئی خبر نہیں تھی کہ وہ کہاں ہیں۔ چالیس دن کی لگاتار دوڑ دھوپ کے بعد اُس کو اپنے بیوی بچے مل گئے۔ وہ بہت خوش ہوا۔ وہ اُن کو ساتھ لے کر سیدھا دہلی آ گیا۔ پرانی سبزی منڈی کے پاس ایک کیمپ میں انھوں نے اپنا عارضی ٹھکانہ جمایا۔ فرقہ وارانہ فساد کی پہلی چنگاری گھنٹہ گھر کے سامنے ایک مسلمان تاجر کی دُکان سے اُٹھی اور دیکھتے دیکھتے ایسی پھیلی کہ سبزی منڈی کے تقریباً سبھی مسلمان جن میں کئی امیر آڑھتی تھے اپنی جان بچا کر باڑا ہندو راؤ کی طرف بھاگے۔ اُن میں سے بہت سے مسلمان ماضی میں دہلی کے اِرد گرد علاقوں سے کام ڈھونڈنے یا نوکری کی تلاش میں خالی ہاتھ آئے تھے۔ وہ خالی ہاتھ چلے گئے۔ یقیناً مال و متاع سے جان زیادہ پیاری تھی۔

سرگودھا میں پاشی ایک چھوٹے سے زمیندار گھنشیام نندن کا لڑکا تھا۔ باپ کو زمینوں سے اچھی آمدنی تھی۔ اُس نے گوپال کو اپنے ساتھ کام پر لگانے کی بہت کوشش کی مگر وہ نہیں مانا۔ گوپال کے دماغ میں آزادی کی مہم میں حصہ لینے کا فتور ایسے گھوم رہا تھا جیسے کوئی چرخی چل رہی ہو۔ باپ نے بہت سمجھایا مگر وہ کہاں سننے والا تھا۔ دراصل اُس نے غریب کاشت کاروں اور مزدوروں کو کھیتوں میں دن رات محنت مشقت کرتے ہوئے اور زمینداروں کو ساری فصل اٹھاتے ہوئے دیکھ کر اُس نے کہا یہ سراسر ناانصافی ہے۔ اُس کی رائے میں زمین کاشت کاروں کی ہونی چاہیے۔ اس خیال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے وہ آزادی کی جنگ میں کود پڑا۔ لیکن وہ تماش بین زیادہ تھا رضا کار کم۔ کیونکہ اُسے کھانے پینے کی کوئی کمی نہیں تھی اور رات کو سونے کے لیے لگا لگایا بستر مل جاتا تھا وہ اتنا سنجیدہ مزاج نہیں تھا۔ موقع ملنے پر وہ اپنے یاروں کے ساتھ بیٹھ کر شراب پیتا تھا اور دُھواں بھی اُڑاتا تھا۔ باپ نے اُس کی آوارہ گردی پر روک لگانے کے لیے اُس کی شادی کرادی۔ اُس کی آوارہ گردی تو بند ہوگئی مگر کام چوری کی عادت نہیں گئی۔

پاشی ہر جلوس یا مظاہرہ میں جھنڈا بھی اُٹھاتا، جوش و خروش بھی دکھاتا اور مظاہرین کے ساتھ مل کر اونچی آواز میں ''ٹوڈی بچہ ہائے ہائے، آزادی ہمارا پیدائشی حق ہے'' جیسے نعرے بھی لگاتا۔ مگر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ کئی بار بغیر آگاہ کیے پولیس مجمع پر لاٹھیاں برساتی تھی اور ضرورت پڑنے پر گولیاں بھی چلاتی تھی۔ اس لیے عام طور پر وہ جلوس یا مظاہرین کے پیچھے پیچھے رہتا تھا۔ وہ اتنا چوکس رہتا تھا کہ پچھلے تین سال میں اُسے خراش تک بھی نہیں آئی تھی۔ جب پنجاب میں پولیس کی لاٹھیوں سے لالہ لاجپت رائے کی موت ہوگی وہ اور بھی چوکس ہوگیا۔ دہلی میں آکر اُسے کافی وقت تک کام نہیں ملا۔ زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا۔ انگریزی میں بہت کمزور تھا۔ تھوڑی بہت انگیزی بول لیتا تھا مگر لکھنے میں کچھ پچ کرتا تھا۔ مزدوری یا کوئی چھوٹا موٹا کام نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مستقل نوکری شاید اُسے کہیں نہ کہیں مل جاتی مگر دس پندرہ دن کے بعد وہ چھوڑ کر گھر آجاتا تھا۔ وہ کسی کے ماتحت کام نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے سسر کی مہربانی سے گھر کا کام چلتا رہا۔ وہ امیر آدمی تھا۔ ہر مہینے کچھ نہ کچھ رقم وہ اپنی لڑکی کو بھیج دیتا

تھا۔ کئی مہاجروں کی طرح اُس نے بھی فسادات میں سامان لوٹا جو گھر چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ اُسے ریڈیو، برتن، فرنیچر وغیرہ مفت میں مل گئے تھے۔ مگر گھر کا خرچ چلانے کے لیے متواتر آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ اُس کی بیوی روز اُس سے جھگڑا کرتی کہ کوئی کام کرو مگر وہ اپنی دُھن کا پکا تھا۔ بچّے بھی ہر روز تماشہ دیکھتے۔ وہ ابھی اتنے چھوٹے تھے کہ اُنھیں سمجھ نہیں آتا کہ جب اڑوس پڑوس میں رہنے والے سبھی آدمی روزانہ کام پر جاتے ہیں اُن کا باپ کیوں نہیں جاتا۔

قسمت سے ایک دن اخبار پڑھتے پڑھتے پاشی کی نظر مرکزی سرکار کے ایک اعلانیہ اشتہار پر پڑی کہ جن مہاجرین نے جنگِ آزادی میں حصّہ لیا تھا سرکار اُن کی خدمت اور قربانی کے لیے ہر مہینے وظیفہ دے گی۔ ساتھ میں تاکید کی کہ جو شخص وظیفہ کے لیے درخواست دے وہ اپنے رضاکار ہونے کا ثبوت درخواست کے ساتھ ضرور لگائے۔ ثبوت کیا ہونا چاہیے اُس کی تفصیل بھی اشتہار میں دی گئی۔ درخواست کہاں دینی ہے اُس دفتر کا پتہ اور ٹیلی فون نمبر بھی دیئے گئے۔ یہ خبر پڑھ کر پاشی کو بہت خوشی ہوئی۔ مگر مشکل یہ تھی کہ اُس کے پاس رضاکار ہونے کا کوئی تحریری ثبوت نہیں تھا۔ ایک صلاح کار کی ہدایت پر اُس نے جعلی صداقت نامہ بنایا جس پر مرکزی سرکار کے ایک نائب وزیر جو تقسیم سے پہلے سرگودھا میں رہتا تھا اُس کے دستخط کیے اور نقلی مہر بھی لگا دی۔ پھر ایک دن وہ عرضی لے کر دفتر چلا گیا۔ سرکاری آفیسر نے اُس کے کاغذات کو غور سے دیکھا اور یہ کہہ کر اُس کی عرضی رکھ لی کہ ایک ہفتے کے اندر اُس کو ڈاک کے ذریعے گھر کے پتے پر جواب بھیج دیا جائے گا۔ اُن دنوں میں وہ ہر روز صبح نہا کر ناشتہ کرنے سے پہلے پوجا کرنے لگا اور خدا سے دُعا مانگتا ''اے خدا، تو کرم فرما ہے، مجھ پر بھی کرم کر۔ مجھے بھی وظیفہ کا حق دار بنا دے۔''

اُس کی بیوی کو حیرانی ہوئی کہ یہ تو منکرِ خدا ہے ایک دم کیسے بدل گیا۔ خیر، اُس کی مراد بر آئی۔ دس دن بعد جب ڈاکیہ رجسٹرڈ لفافہ لے کر آیا تو اس نے کانپتے ہاتھوں سے اُسے کھولا۔ دو سو روپے مہینے وظیفہ کی منظوری کی خبر پڑھ کر ناچنے لگا۔ جب اُس کی بیوی نے بھی یہ خبر سنی تو اُس کی دَبی ہوئی مسکراہٹ ہونٹوں پر ناچنے لگی۔

وظیفہ ملنے سے پاشی کی چال ڈھال، وضع قطع اور تکیہ کلام میں فرق آ گیا۔ لوگ اس غلط فہمی میں تھے کہ سرکار کی طرف سے رضا کار ہونے کا سرٹیفکیٹ اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ پاشی کا سرکاری دفتروں میں رسوخ ہے جس کی وجہ سے وہ کوئی کام بھی کروا سکتا ہے۔ پاشی نے لوگوں کے اسے گمان کا پورا فائدہ اُٹھایا۔ وہ سرگودھا کے پُرانے تاجروں سے ایک ایک کر کے ملنے جاتا اور اپنے رسوخ کی ڈینگ مارتا۔ کئی تو اُس کو ڈھونگی سمجھ کر نظر انداز کر دیتے۔ مگر کئی لوگوں کو اُس کی باتوں پر یقین آ جاتا۔ وظیفہ شروع ہونے کے تین چار مہینے بعد اُس نے روز مرّہ کی زندگی کا ایک دستور بنا لیا۔ صبح نہا دھو کر سفید دھوتی اور لمبا سفید کُرتا پہن کر اور سر پر سفید گاندھی ٹوپی رکھ کر بغیر ناشتہ کئے گھر سے نکل جاتا۔ روشن آرا روڈ پل بنگش، آزاد مارکیٹ، باڑہ ہندوراؤ، قطب روڈ اور آخر میں صدر بازار اُس کے راستے کے اہم پڑاؤ تھے۔ ناشتہ روشن آرا روڈ پر کسی ٹرک ڈیلر کے یہاں کرتا۔ لنچ صدر بازار میں کسی تاجر کے یہاں کرتا اور اسی طرح شام کی چائے پکوڑوں کے ساتھ کسی نہ کسی واقف کار کی دُکان پر کرتا۔ شام کو سات بجے وہ گھر لوٹتا۔ وہ پیدل جاتا اور پیدل آتا۔

اب اُسے دال روٹی کی کوئی فکر نہیں تھی۔ وظیفہ کے علاوہ کچھ جان پہچان والے اُسے گاہے بگاہے کوئی تحفہ بھی دے دیتے تھے خاص طور پر کسی تہوار پر۔ کبھی کبھی وہ اندر ہی اندر ہنستا ''لوگوں کو بے وقوف بنانا کوئی اتنا مشکل کام نہیں ہے۔'' وقت وقت پر وہ تھوڑا بہت مذاق بھی کر لیتا۔ ایک بار اُس نے ایک واقف کار سے کہا۔ ''کیوں رادھے تمھاری دوسری بیوی ابھی ملی کہ نہیں یا پہلی کی طرح وہ بھی مہاجروں کی بھیڑ بھاڑ میں کھو تو نہیں گئی؟'' پھر ہنس کر کہنے لگا ''تیرے سے دس سال چھوٹی ہے۔ کہیں کسی یار کے ساتھ بھاگ تو نہیں گئی؟''

یہ بات رادھے کو اچھی نہیں لگی۔ وہ منہ بنا کر کہنے لگا۔ ''پاشی صاحب، آپ اتنے سلجھے ہوئے شخص ہیں۔ آپ بھی ذاتی مذاق کرتے ہیں۔''

پاشی نے ہنستے ہوئے کہا ''یار، تُو تو بُرا مان گیا۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔''

ایسے ہی سرگودھا کے ایک پڑوسی نے اُس سے مسکراتے ہوئے بولا'' کیوں سورج تیری

بیوی ابھی بھی تجھے ڈانٹتی ہے؟ ڈنڈی سے مارتی تو نہیں؟''

اُس نے جواب دیا ''پاشی جی، اب وہ بدل گئی ہے۔ ہاتھوں میں درد ہوتا ہے۔ روٹی بیلنے میں دقت ہوتی ہے۔ اب کیا اُٹھائے گی مجھ پر ہاتھ۔ اب تو میں ہاتھ اُٹھاتا ہوں۔ چوں تک نہیں کرتی۔''

کبھی کبھی پاشی رات کو گھر دیر سے آتا۔ رانی کو شک ہوا کہ یا تو یہ شراب پینے لگ گیا ہے یا اس کے کسی غیر عورت کے ساتھ ناجائز تعلق ہیں۔ وہ اگر دیر سے آنے کی وجہ پوچھتی تو ہنس کر کہتا ''لمبی بات ہے اب میں تھکا ہوا ہوں۔ نیند آرہی ہے۔ کل بتاؤں گا۔'' کل کیا بتانا تھا۔ صبح وہ پھر گھر سے نکل گیا اور رات کو دیر سے آیا۔ ہفتے میں اس طرح وہ تین چار بار دیر سے آتا جو رانی کی آنکھوں میں کھٹکنے لگا۔ اُس کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا جو وہ اُسے آڑے ہاتھوں لے سکتی۔ محض شک کی بنا پر وہ اُسے بُرا بھلا کہہ سکتی تھی یا چار آنسو بہا سکتی تھی۔ حقیقت میں نہ وہ شراب پیتا تھا نہ اُس کے کسی عورت کے ساتھ ناجائز تعلق تھے۔ وہ جانتا تھا کہ اگر کوئی بُری حرکت کرتا ہوا پکڑا گیا تو اُس کا وظیفہ بند ہو جائے گا۔ لیکن وہ رانی کو صحیح بات نہیں بتاتا تھا۔ اُس کی چڑ چڑاہٹ اور جھنجھلاہٹ سے وہ چسکیاں لیتا تھا۔ وہ جتنا اُونچا بولتی پاشی اتنا زیادہ مزہ لیتا۔

ایک رات اُس نے اپنے کسی دوست کو پوسٹ کارڈ، ادھورا لکھ کر میز پر چھوڑ دیا کہ صبح اُسے پورا کر دے گا۔ اور اُس کا پتہ لکھ کر لیٹر باکس میں ڈال دے گا۔ اتفاق سے وہ پوسٹ کارڈ پورا کرنا بھول گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب رانی کمرے کی صفائی کرنے آئی تو اُس کی نظر پوسٹ کارڈ پر پڑی۔ کیونکہ پوسٹ کارڈ ہندی میں لکھا ہوا تھا اُسے پڑھنے میں کوئی مشکل درپیش نہیں آئی۔ جب اُس نے آخری دو سطریں پڑھیں تو وہ تلملا اُٹھی۔ نہ جانے کب سے وہ اپنے خاوند کے ناجائز تعلقات کا ثبوت ڈھونڈ رہی تھی جو اُسے اُس خط میں مل گیا۔ حقیقت میں وہ کوئی ثبوت نہیں تھا۔ مگر تعصب کی وجہ سے رانی نے وہ دو لائنس پڑھ کر یہ نتیجہ نکالا کہ اُس کے کسی دوسری عورت کے ساتھ ناجائز تعلق ہے۔ شام کو جب پاشی گھر آیا تو اچانک اُس کو پوسٹ کارڈ کا خیال آیا۔ پوسٹ کارڈ میز پر نہ پاکر اُس نے رانی سے

پوچھا۔ ''یہاں پر ہر ایک پوسٹ کارڈ پڑا تھا۔ تم نے تو نہیں دیکھا؟''

رانی نے لاپرواہی سے کہا ''میں نے نہیں دیکھا'' پاشی خاموش ہو گیا۔

رانی نے اپنے شوہر سے اس خط کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا کوئی معقول جواب نہیں ملے گا۔ اس کے برعکس وہ مجھے ڈانٹے گا۔ بے وقوف کہے گا اور شاید غصّے میں مجھے ایک آدھ تھپڑ بھی لگا دے گا۔ اپنی محبوبہ کی بے عزتی کوئی عاشق برداشت نہیں کر سکتا۔ مگر وہ اطمینان سے بیٹھنے والی نہیں تھی۔ اُس نے سوچا کہ اپنے شوہر کی بے وفائی کی پول نزدیکی رشتے داروں کے سامنے کھولی جائے تب اس کی عقل ٹھکانے آئے گی۔ اس نے دو نزدیکی رشتے داروں کو پاشی کی طرف سے اور دو کو اپنی طرف سے ایک شام چائے پر مدعو کیا۔ پاشی سے کہا ''آپ گھر پر رہنا۔ آج شام پانچ بجے کچھ رشتہ دار آ رہے ہیں۔'' جب پاشی نے پوچھا ''وہ کس لیے؟'' تو رانی نے کہا ''یونہی بہت عرصہ سے کوئی نہیں آیا۔ میرا دل کہہ رہا تھا اُنھیں چائے پر بلالوں۔'' پاشی کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔

چائے پینے کی بعد رانی نے اپنے رشتے داروں کو مخاطب کرتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے کہا ''مجھے یہ بتاتے ہوئے بڑی شرم آتی ہے کہ میرے پتی دو تین بچوں کے باپ ہو کر اتنی عمر میں مجھے چھوڑ کر کسی غیر عورت سے ناجائز تعلقات رکھتے ہیں۔ میں نے ان کی اتنے سال خدمت کی ہے۔ اس کا صلہ مجھے یہ ملا ہے کہ ان کے ناجائز تعلقات کو میں کڑوا گھونٹ سمجھ کر پی جاؤں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' جب پاشی کے بڑے بھائی سوداگر نے پوچھا ''تم یہ سب کیسے جانتی ہو؟'' تو وہ جھٹ بول اُٹھی ''میرے پاس اس کا ثبوت ہے۔''

سوداگر نے پاشی سے پوچھا ''کون ہے یہ عورت؟''

پاشی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ''اسی سے پوچھئے۔ میں کسی غیر عورت کو جانتا تک نہیں۔ میرا کسی سے کوئی ناجائز تعلق نہیں ہے۔''

رانی بیچ میں بول اُٹھی ''یہ جھوٹ بول رہے ہیں۔''

رانی کے چاچا نے کہا ''بیٹی، بات کو اتنا طول کیوں دے رہی ہو؟ اگر تمھارے پاس کوئی ثبوت ہے تو اسے دِکھا دو۔''

رانی وہاں سے اُٹھ کر کمرے میں گئی اور اسٹیل کی الماری کھول کر اُس میں سے خط نکالا اور لے آئی۔ پہلے وہ خط سوداگر نے پڑھا۔ پڑھ کر وہ ہنسنے لگا۔ باری باری سب رشتے داروں نے وہ خط پڑھا۔ جو بھی پڑھتا اپنی ہنسی کو نہیں روک سکا۔ رانی کو طیش آ گیا۔ کہنے لگی۔ ''اتنا سنجیدہ معاملہ ہے، آپ لوگ ہنس رہے ہیں۔ میرا مذاق اُڑا رہے ہیں۔''

سوداگر نے وہ پوسٹ کارڈ رانی کو دوبارہ پکڑاتے ہوئے کہا ''پھر پڑھو۔ غور سے پڑھو۔''

رانی نے کہا ''اس میں صاف لکھا ہے وہ کسی غیر عورت سے محبت کرتے ہیں۔''

سوداگر نے کہا ''ایک بار پھر پڑھو۔ ہمیں پڑھ کر سناؤ۔''

رانی نے وہ دو لائنیں زور سے پڑھیں۔ ''جب میں ندرا دیوی کی گود میں سو جاتا ہوں مجھے بہت آنند ملتا ہے۔''

سب ہنسی ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ رانی حیرانی سے اپنا منہ کھول کر اُن سب کے منہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر بھی بات اُس کی سمجھ نہیں آئی کہ 'یہ ندرا دیوی' کون ہے۔

OO

بڑا بابو

انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس (IAS) کے ابتدائی امتحان میں پاس ہونے کے بعد جب یونین پبلک سروس کمیشن (UPSC) نے انٹرویو کے لیے ہری پرشاد لکھوٹیا کو دہلی بلایا تو اُسے کوئی خاص گھبراہٹ نہیں ہوئی۔ اُسے یقین تھا کہ وہ انٹرویو میں پاس ہوجائے گا اور انتخابی فہرست میں اُس کا نام آجائے گا۔ یا تو اُسے اپنی خوداعتمادی پر ناز تھا یا پھر وہ ڈینگ مار رہا تھا۔ مگر تھا وہ کافی ہوشیار، چست چالاک اور حاضر جواب۔ اُس نے سُن رکھا تھا کہ انٹرویو میں کمیشن کے صدر کو پورا اختیار ہے کہ وہ سو میں سو نمبر دے سکتا ہے۔ اُس نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ وہاں سفارش بھی چلتی ہے۔ کوئی شک نہیں کہ سرکار کے موجودہ یا پنشن یافتہ سیکریٹری عدالت العالیہ اور عدالت علیا کے ریٹائرڈ یا کرسی پر بیٹھے حاکموں اور بڑے بڑے وزرا کے لڑکے اور لڑکیاں کمیشن کے ممبران کی ذاتی سخاوت اور مہربانی سے چنے جاتے ہیں۔ کافی دوڑ دُھوپ اور زور لگانے پر اُس نے بھی ایک سفارش ڈھونڈی۔ اُس کو صرف ایک ہی خدشہ تھا کہ اُس سفارش میں اتنا دم نہیں تھا کہ وہ بے فکری کی نیند سو سکے۔ وہ شخص دو سال پہلے یو۔ پی۔ ایس۔ سی سے پنشن لے کر علیحدہ ہوا تھا۔ مگر وہ پچھڑی ذات یعنی شیڈول کاسٹ کا تھا۔ اُس کی سفارش اتنی پُر زور اور پُر اثر نہیں تھی۔ اونچی ذات والے امیر اُس کے رفیق ہوتے ہوئے بھی اُس سے دُور رہتے تھے۔ اگر سرکار کا ڈنڈا نہ ہوتا تو شاید وہ اُس سے بات بھی نہ کرتے۔

انٹرویو والے دن ہری پرشاد نہا دھو کر صاف ستھرے کپڑے پہن کر یو۔ پی۔ ایس۔ سی کے دفتر میں مقررہ وقت سے دس منٹ پہلے پہنچ گیا۔ ٹھیک وقت پر اُسے بلایا گیا۔ اُس نے

دروازے پر ہلکی سی دستک دی اور تھوڑا سا دروازہ کھول کر کہا ''سر، میں اندر آ سکتا ہوں۔'' اندر سے آواز آئی آ جاؤ۔ اُس نے آہستہ سے دروازہ بند کیا اور صدر کے ساتھ چار ممبران کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا اور بڑی حلیمی سے کہا ''گوڈ مارنگ سر'' ممبران نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک ممبر نے خالی کُرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''بیٹھ جاؤ۔'' اس کے بیٹھتے ہی انٹرویو شروع ہو گیا جو تقریباً پچاس منٹ تک چلا۔ شروع میں انھوں نے اُس سے کئی علمی اور غیر علمی سوال کیے جس کا جواب اُس نے تقریباً صحیح دیا۔ آخر میں لکھوٹیا کی عام ذہانت اور مزاج شناسی جاننے کے لیے ہر ممبر نے ایک ایک سوال کہا۔ پہلے نے پوچھا

''آپ کہاں سے آ رہے ہیں؟''

''دہرہ دون سے'' لکھوٹیا نے جواب دیا۔

''آپ کیسے آئے؟''

''جی میں ریل گاڑی سے آیا۔''

''جب آپ گاڑی کے ڈبے میں بیٹھے تھے آپ نے کھڑکی کے باہر کیا کیا دیکھا؟'' ممبر نے پوچھا۔

لکھوٹیا نے جھٹ جواب دیا۔ ''سر، میں رات کی گاڑی سے آیا تھا۔''

دوسرے ممبر نے پوچھا ''چائے بنانے کے لیے پانی کو کتنی دیر تک اُبالنا چاہیے؟''

لکھوٹیا نے پھرتی سے جواب دیا ''سر، میں چائے نہیں پیتا۔''

تیسرے ممبر نے ایک عجیب و غریب سوال کیا؟ ''اگر آپ غلطی سے اپنی جوان بہن کے کمرے میں چلے جاتے ہیں، جو اُس وقت اتفاقاً ننگی کھڑی کپڑے بدلنے کی تیاری کر رہی ہے آپ اُس کو دیکھ کر کیا کریں گے؟'' لکھوٹیا نے ہلکی سے مسکان کے ساتھ کہا ''سر، میری کوئی بہن نہیں ہے۔''

چوتھے ممبر نے پوچھا ''اگر UPSC آپ کو نہیں چنتی آپ اُسے گالیاں تو ضرور دیں گے جیسے کئی ناکامیاب امیدوار کرتے ہیں۔''

لکھوٹیا نے جواب دیا ''سر، ایسی ضرورت نہیں پڑے گی۔''

''وہ کیوں'' ممبر نے پوچھا۔

''سر، مجھے پورا یقین ہے آپ مجھے چن لیں گے۔ سرکار کی طرف سے آپ مجھے عوام کی خدمت کرنے کا موقع دیں گے۔''

ممبر نے ہلکی سے مسکراہٹ کے ساتھ کہا'' کافی حاضر جواب لگتے ہو۔''

آخر میں صدر نے ایک سوال کیا'' آپ کس طرح کی لڑکی سے شادی کرنا پسند کریں گے؟''

لکھوٹیا نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا'' سر، فی الحال شادی کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔''

لکھوٹیا نے سبھی سوالوں کا جواب اُلٹا دیا۔ وہ دہرہ دُون سے دن کی گاڑی سے آیا تھا۔ چائے خود بنا کر پیتا تھا۔ اُس کی ایک بڑی بہن تھی۔ ناکامیابی کی صورت میں وہ UPSC کو گالیاں بھی ضرور دیتا اور شادی کرنے کا اُس کا مصمم ارادہ تھا۔ اس نے ایک لڑکی پسند کر رکھی تھی۔ مگر اُس نے اپنی حاضر جوابی اور تیز طبعی سے ہر سوال کا جواب ایسے دیا جیسے وہ سچ بول رہا ہو۔ اُس کے چلے جانے کے بعد ممبران آپس میں بات چیت ہوئی۔ سبھی ممبر جانتے تھے کہ لکھوٹیا نہایت ہی ہوشیار اور حاضر جواب لڑکا ہے۔ ایک نے کہا'' میرے خیال میں اُسے لے لینا چاہیے۔ آج کل کے وزیروں کو ایسے آفیسروں کی ضرورت ہے جو جنتا کو سبز باغ دکھا کر پیچھے سے لال جھنڈی لہرائیں۔ ہمارے وزرا یہی چاہتے ہیں کہ اُن کے کارناموں پر پردہ ڈالنے کے لیے تیز فہم اور حاضر جواب آفیسر ہو۔

دوسرے ممبر نے کہا'' میں آپ کی رائے سے سو فیصدی متفق ہوں۔''

تیسرے نے اپنی بات کہی'' اپنے پرانے ساتھی کی سفارش کو مدنظر تو رکھنا ہی پڑے گا۔'' نتیجہ یہ ہوا کہ لکھوٹیا کو تین سو میں سے دو سو نوّے ممبر ملے۔ لکھوٹیا فہرست میں اٹھارویں نمبر پر آیا۔ وہ چن لیا گیا۔

سروس میں داخل ہونے پر بھی اُس کے نظریہ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ خلقِ خدا کے ساتھ اس کا سلوک ویسا ہی رہا جیسے پہلے تھا۔ اُس کے نزدیکی ساتھی اور دوست

اُسے 'ٹرخاؤ ماسٹر' کہتے تھے۔ وہ اتنی صفائی اور اطمینان سے ٹال دیتا تھا کہ اُس کے اوپر آج تک کوئی آنچ تک نہیں آئی تھی۔ اتفاق سے اُسے دو سال کے لیے وزارتِ تجارت کے لائسنس محکمہ میں ڈپٹی سیکریٹری کے عہدہ پر مقرر کر دیا گیا۔ لائسنس راج میں پاؤں رکھتے ہی نوٹوں کے لفافے آنے شروع ہو گئے۔ اس محکمہ میں کام کرنے والے چپراسی سے لے کر ڈپٹی سیکریٹری تک چھٹی نہیں لیتے تھے جتنی کمائی سارے دن میں ہوتی تھی اُسے یکجا کیا جاتا تھا اور ہر بابو کو اُس کی تنخواہ کے حساب سے اپنا حصہ مل جاتا تھا۔ جو بابو چھٹی پر ہوتا وہ اُس دن حصے کا حقدار نہیں گنا جاتا تھا۔ اس لیے کوئی کارندہ چھٹی لینے سے پہلے دس بار سوچتا تھا۔ اُسے یہ بھی ڈر تھا کہ اُس کی غیر موجودگی میں اُس کا تبادلہ نہ کر دیا جائے۔ بیوپار کے میدان میں ایک نئے کھلاڑی نے پہلی بار جب لائسنس کی درخواست دی تو اُس نے تہیہ کر لیا وہ رشوت نہیں دے گا۔ نتیجہ کیا ہوا جہاں گھوس دینے سے پندرہ دن میں کام ہو جاتا وہاں دو مہینے گزر گئے اور ابھی تک اُس کی فائل بھی نہیں کھلی تھی۔ وہ چکّر لگا لگا کر تنگ آ گیا۔ کسی بھلے مانس کی مہربانی سے اُس کی ملاقات منسٹر سے ہوئی۔ منسٹر نے سیکریٹری کو ہدایت کی کہ اس شخص کا کام پندرہ دن کے اندر اندر ہو جانا چاہیے۔ لائسنس نہ ملنا تھا نہ ملا۔ دو مہینے اور گزر گئے۔ وہ ایک بار پھر وزیر صاحب سے جا کر ملا اور سارا ماجرہ بیان کیا۔ وزیر صاحب نے مختصر طور پر جواب دیا۔ ''بھائی کچھ دے دلا کر کام نپٹاؤ۔ سرکاری دفتروں میں کام ایسے ہی چلتا ہے۔'' ایسے ہی لکھوٹیا کے چاچے نے ٹیلی فون پر کسی شخص کو سفارش کی کہ کسی طرح سے اس کا کام کروا دو۔ لکھوٹیا نے جواب دیا ''چاچا جی، آپ کہیں اور کام نہ ہو۔ آپ اُسے کل میرے دفتر بھیج دیجیے۔''

اگلے دن وہ شخص لکھوٹیا کے دفتر میں گیا۔ جب وہ اُس کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ کرسی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور ملاقاتی سے تپاک سے ملا اور عزت سے کرسی پر بٹھایا۔ اُس کی ساری بات سننے کے بعد لکھوٹیا نے کسی آفیسر کو فون کیا ''مجیٹھیا صاحب، آپ سے ایک نہایت ضروری کام ہے اور درخواست بھی۔ مسٹر پپن بہاری اس وقت میرے سامنے بیٹھے ہیں۔ ان کا کام جیسے بھی ہو کروا دو۔ یہ آپ کو ساری بات تفصیل سے بتا دیں گے۔''

لکھوٹیا نے اُس آفیسر کا نام اور فون نمبر کاغذ پر لکھ کر پون بہاری کو پکڑا دیا۔ وہ بہت خوش ہوا اور لکھوٹیا کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا۔ جاتے وقت لکھوٹیا نے اُس سے کہا ''ہمارے چاچا جی کو بتا دیجیے گا۔ میں اُن کی بڑی عزت کرتا ہوں۔''

جونہی وہ کمرے سے باہر گیا چپراسی نے دروازہ بند کر دیا۔ اُس کے جاتے ہی لکھوٹیا نے اُسے دوبارہ فون کیا ''مجیٹھیا، یار تمھیں ابھی ابھی میں نے جس شخص کی سفارش کی تھی اُسے نظر انداز کر دینا۔ وہ میرا کچھ نہیں لگتا۔ اگر عام طریقے سے کام ہو جائے تو ٹھیک ہے ورنہ آؤٹ آف وے (خاص کوشش) جانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

دوسری کسی ملازمت کے مقابلے میں آئی.اے.ایس کی ترقی کے سیڑھی سیدھی اور چھوٹی ہوتی ہے۔ اگر کسی کا اپنی بے وقوفی یا قدرت کی مار سے پاؤں نہ پھسل جائے تو ریٹائر ہونے سے پہلے سب سے بڑے عہدے یعنی سیکریٹری تک تو پہنچ جائے گا۔ اس کو دفتر کے کام کی اتنی فکر نہیں ہوتی جتنی اپنی ترقی کی جس کی وجہ سے نہ صرف تنخواہ میں اضافہ ہو جاتا ہے بلکہ ساتھ ساتھ رتبہ بھی بڑھ جاتا ہے۔ لکھوٹیا بھی اُن میں سے ایک تھا۔ مگر اُس کی ترقی اُس رفتار سے نہیں ہوئی جتنی عموماً ہوتی ہے۔ کیونکہ ٹرخانا اُس کا طریقۂ عمل بن چکا تھا۔ وہ اونچے آفیسروں کو بھی نہیں چھوڑتا تھا۔ واجباً اُس کی خفیہ رپورٹ میں سینئر آفیسر اس کے خلاف کچھ نہ کچھ لکھ دیتا تھا۔ جب اُس سے ایک جونیئر آفیسر کو ڈائریکٹر بنا دیا گیا تو اُسے بڑا افسوس ہوا۔ تاہم جب ریٹائر ہونے میں دو سال رہ گئے تھے اُسے مزید سیکریٹری بنا دیا گیا۔

ایک دن پاشی کے ایک پرانے دوست اور ہم جماعت بلدیو راج ملک کا فون آیا۔ وہ اُس وقت اندور میں پچھلے چار سال سے کلکٹر کی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ چاہے اُن کا آپس میں ملنا جلنا بہت کم ہوتا تھا، مگر گاہے بگاہے فون پر بات ہو جاتی تھی۔ دُعا سلام کے بعد اُس نے لکھوٹیا سے کہا ''تمھارے محکمہ نے ایک ٹیکنکل پوسٹ کے لیے اخبار میں اشتہار دیا ہے۔ تم میرے چھوٹے لڑکے رندھیر کو جانتے ہو۔ اُس نے حال ہی میں بنارس سے ڈگری حاصل کی ہے۔ اُس کے پاس بالکل وہی قابلیت ہے جو اُس نوکری کے لیے چاہیے۔ وہ اس عہدے

کے لیے بالکل فٹ بیٹھتا ہے۔ میں نے اُسے عرضی دینے کے لیے کہہ دیا ہے کیا خیال ہے تمھارا؟"

لکھوٹیا نے جواب دیا "عرضی دینے میں کیا ہرج ہے؟ جہاں تک ممکن ہے میں اُس کی عرضی پر نظر رکھوں گا۔ باقی تو تم جانتے ہی ہو کہ اس کا فیصلہ بورڈ کرے گا۔ اگر رندھیر کو یہ نوکری مل جائے تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔"

اس واقعہ کو دو مہینے گزر گئے۔ رندھیر کو تقرری کا خط ملنا تو در کنار انٹرویو کے لیے بھی کوئی بلاوا نہیں آیا۔ ملک نے پھر پاشی کو فون کیا۔ پاشی نے جواب دیا "یار، یہ پوسٹ وزیر صاحب کے کہنے سے نکالی گئی تھی۔ وہ کرسی پر اپنے کسی عزیز کو بٹھانا چاہتے تھے۔ دوسرے الفاظ میں اخبار میں اشتہار دینے سے پہلے ہی عہدہ دار چن لیا گیا۔ یار، مجھے افسوس ہے میں تمھاری مدد نہیں کر سکا۔"

ملک کو بُرا لگا مگر اُس نے لکھوٹیا کو کوئی ایسی ویسی بات نہیں کہی۔ بس اتنا ضرور کہا "اگر تمھیں معلوم تھا کہ......" لکھوٹیا نے بات کاٹتے ہوئے کہا "میں تمھاری ناراضگی کو سمجھتا ہوں۔ جس دن تم نے پہلی بار اس پوسٹ کے بارے میں فون کیا تھا میں خود اس بارے میں نہیں جانتا تھا۔"

ملک نے تبصرہ کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا "اگر ایسی بات تھی تو پوسٹ کے لیے اشتہار کیوں دیا گیا؟"

"یار، تم تو جانتے ہو سرکاری کاموں میں خانہ پوری کی جاتی ہے تاکہ کسی اخبار والے کو کیچڑ اُچھالنے کا موقع نہ ملے۔"

کچھ مہینے گزرنے پر جب ملک کو معلوم ہوا کہ اُس پوسٹ پر جس شخص کو چنا گیا وہ وزیر کا آدمی نہیں تھا، وہ لکھوٹیا کے بڑے بھائی کا لڑکا تھا۔ نہ ہی یہ پوسٹ وزیر صاحب کے کہنے پر نکالی گئی تھی۔ ملک نے دل میں سوچا "لوگ مجھے ٹرخانے میں گورو سمجھتے ہیں لکھوٹیا تو میرا بھی گورو نکلا۔"

OO

یہ کس کا چہرہ

ویسے تو ہری موہن اگروال سمجھ دار اور تجربہ کار آدمی تھا مگر اُسے کسی آدمی کو پہچاننے میں مشکل درپیش آتی تھی چاہے وہ رشتہ دار ہو یا پڑوسی۔ کسی کا چہرہ دس بار دیکھ کر بھی وہ بھول جاتا تھا۔ وہ ہر شخص کی پہچان یا تو اُس کی آواز سے کرتا یا کسی علامت سے۔ مثال کے طور پر وہ شخص ٹوپی یا پگڑی پہنتا ہے یا سر سے گنجا ہے یا ہاتھ میں سوٹی لے کر چلتا ہے۔ بیوی کے ساتھ رہتے ہوئے برسوں ہو گئے تھے لیکن اگر وہ اُسے گھر سے باہر مل جائے تو اُسے بھی شناخت کرنے میں دقت ہوتی تھی۔ ایسے ہی وہ اپنے دونوں بچوں کو پہچاننے میں غلطی کر جاتا تھا۔ ایک دفعہ وہ گھر بیٹھا تھا۔ اُس کی بیوی سرلا نے کہا۔ ''میں بہت تھک گئی ہوں۔ آج آپ ہی بچوں کو اسکول سے لے آیئے۔'' وہ اسکول گیا۔ دونوں بچے اُس کے سامنے کھڑے تھے۔ وہ دوسرے بچوں سے پوچھ رہا تھا۔ ''تم بلّو ہو۔ تم ببلا ہو۔'' اُس دن کے بعد جہاں تک ممکن تھا سرلا بچوں کو اسکول سے خود لاتی تھی۔ پڑوسیوں، رشتے داروں اور یار دوستوں کی شناخت وہ اُن کے گھر کی عمارت سے کرتا تھا۔ اسے عمارت کے خدوخال یاد رہتے تھے مگر کسی دوست یا رشتہ دار کے نہیں۔ لوگ کہتے تھے اس کی آنکھیں کمزور ہیں۔ کئی مذاق بھی کرتے تھے۔ ''کسی کا سانولا چہرہ اس کو بھینس کے رنگ جیسا یا کسی حبشی کی طرح لگتا ہے۔ سفید چہرے والے شخص کو وہ انگریز سمجھتا ہے۔'' کسی کی آنکھیں چھوٹی ہوں یا بڑی۔ ناک لمبی ہو یا پتلی۔ کان ہاتھی کی طرح ہوں یا کترے ہوئے، اُس کو سب چہرے تقریباً برابر لگتے تھے۔ اُس نے آنکھوں کے ڈاکٹر کو دکھایا۔ معائنہ کرنے کے بعد ڈاکٹر نے کہا ''مجھے تو آپ کی آنکھوں میں کوئی خرابی

نہیں لگتی۔ آپ بالکل ٹھیک ہیں۔" جب اُس نے یہ بات اپنے ایک دوست کو بتائی تو اُس نے کہا۔" ہری موہن آدمی کی اصلی آنکھیں اُس کے دماغ میں ہوتی ہیں۔"

ایک رشتہ دار نے رائے دی کہ کسی نفسیاتی ڈاکٹر سے جانچ کروانی چاہیے۔ میرے خیال میں پیدائش کے وقت تمھارے دماغ میں کوئی کمی رہ گئی تھی۔ کچھ سوچنے کے بعد اگروال ڈاکٹر جیکب ڈیسوزا سے ملنے کے لیے گیا۔ ڈاکٹر نے معائنہ کرنے کے بعد اُس سے کہا" آپ کو کچھ ٹیسٹ کروانے پڑیں گے۔ وہ ٹیسٹ کیا ہوں گے میں کاغذ پر لکھ دیتا ہوں۔ آپ ماڈرن ریسرچ سینٹر میں چلے جایئے۔ وہ آپ کو سب سمجھا دیں گے۔ فی الحال میں پندرہ دن کی دوا لکھ دیتا ہوں۔ پندرہ دن ہونے پر آپ مجھ سے پھر ملئے"

جب ہری موہن ڈاکٹر کے پاس اگلی بار گیا تو ڈاکٹر نے تو اُسے پہچان لیا مگر اگروال نے ڈاکٹر کو نہیں پہچانا۔ اُس نے ڈاکٹر سے کہا" آپ کون ہیں؟" ڈاکٹر کو کچھ بُرا لگا مگر اُسے فوراً خیال آیا کہ اس مریض کو چہروں کی شناخت کرنے میں مشکل ہوتی ہے۔ اگروال تین مہینے تک ڈاکٹر کی دوا کرتا رہا۔ کیونکہ ٹیسٹ کروانے پر بہت خرچا ہوتا تھا، اس نے ارادہ ترک کر دیا۔ جب بھی وہ ڈاکٹر سے ملتا وہ یہی سوال کرتا" آپ کون ہیں؟" ایک دن ڈاکٹر کو غصہ آ گیا۔ اُس نے کہا" آپ کسی اور ڈاکٹر سے علاج کروایئے۔ میں آپ کا علاج نہیں کر سکتا۔"

جس دفتر میں اگروال کام کرتا تھا وہ اپنے ساتھیوں وغیرہ کی پہچان اُن کے چہرے سے نہیں بلکہ اُن کی کسی خاص علامت سے کرتا تھا۔ جیسے ناظر کی پہچان اس کے ڈھیلے چشمے سے، کلرک کی ٹائپ رائٹر سے، اسسٹنٹ کی فائلوں کے ڈھیر سے یا اُن سب کی سیٹوں سے۔ کئی لوگوں کی پہچان وہ اُن کی آواز یا چال سے کرتا تھا۔ کسی کو بڑی یا چھوٹی آنکھ، بالوں کی بناوٹ وغیرہ سے کرتا تھا۔ ایک دفعہ ناظر نے اُس سے کہا" یہ فائل ڈائیریکٹر کو دے آؤ۔ سیکریٹ ہے۔ چپراسی کے ہاتھ نہیں بجھوا سکتا۔" وہ ڈائریکٹر کا کمرہ جانتا تھا۔ وہ اُس کے کمرے میں گیا۔ فائل دینے سے پہلے پوچھنے لگا۔" آپ ڈائریکٹر ہیں؟" یہ سن کر ڈائریکٹر کو بڑا عجیب لگا اُس نے پوچھا" تم کون ہو؟" اگروال نے جواب دیا" سر، آپ کا

اسسٹنٹ ہوں۔'' ڈائریکٹر نے پھر پوچھا۔ ''یہاں کتنے عرصے سے کام کر رہے ہو؟'' اگروال نے جواب دیا ''سر، کوئی دس سال سے۔'' ڈائریکٹر نے غصّے میں کہا ''اتنے سال سے کام کر رہے ہو اور یہاں کئی بار آ چکے ہو۔ اپنے ڈائریکٹر کو بھی نہیں پہچانتے۔ لگتا ہے تمھارے دماغ میں کوئی خرابی ہے۔ اس کا علاج کرو۔ ورنہ نوکری سے نکال دیئے جاؤ گے۔ اگروال بہت گھبرایا۔ ناظر نے اُس کو تسلّی دیتے ہوئے کہا ''گھبراؤ نہیں۔ میں ڈائریکٹر صاحب کو سمجھا دوں گا۔''

ہری موہن کا باپ چندر موہن رانچی میں فارسٹ آفیسر تھا۔ کسی سرکاری کام سے وہ علی گڑھ آیا۔ کام جلدی ختم ہو گیا۔ اُس نے سوچا اپنے لڑکے سے ملتا جاؤں۔ اتوار کا دن تھا۔ ہری موہن گھر پر تھا۔ کوئی پانچ بجے شام چندر موہن نے گھنٹی بجائی۔ ہری موہن نے دروازہ کھولا۔ اُس نے اپنے باپ کو نہیں پہچانا۔ پوچھنے لگا۔ ''آپ کون ہیں؟ یہاں کیا کام ہے؟'' چندر موہن کو بہت غصّہ آیا۔ اُس نے زور سے کہا ''احمق ہے تُو۔ اپنے باپ کو بھی نہیں پہچانتا۔'' اُس نے جھٹ اپنے باپ کی آواز سے انھیں پہچان لیا اور کہنے لگا ''پتا جی، معاف کیجیے۔ میں کسی خیال میں تھا۔ آپ کو دھیان سے نہیں دیکھا۔'' ایسے ہی ایک اور واقعہ ہوا۔ چُھٹی والے ایک دن ہری موہن اپنی بیوی اور بچوں کو ساتھ لے کر گھومنے پھرنے کے لیے چنبیلی پارک گیا۔ باغ میں رنگ برنگے پھول دیکھ کر بچّے بہت خوش ہوئے۔ ہری گھاس پر دوڑنے میں اُن کو مزا آیا۔ جب وہ تھک گئے تو باپ سے کہنے لگے ''پتا جی، بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔'' وہ اُنھیں پارک کے اندر ایک ریسٹورنٹ میں لے گیا۔ کھلی ہوا میں وہ ایک میز کے گرد بیٹھ گئے۔ سب نے اپنی اپنی پسند کا کھانا کھایا۔ نکلنے سے پہلے ہری موہن نے سرلا سے کہا ''تم تھوڑی دیر رُکو۔ میں باتھ روم ہو کر آتا ہوں۔'' ریسٹورنٹ کے پیچھے کئی ٹائلٹ تھے۔ جب وہ باہر نکلا تو وہ بھول گیا کہ بیوی اور بچے کہاں ہیں۔ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے وہ ایک میز کے پاس گیا جہاں دو بچّے بیٹھے ہوئے تھے۔ اُس نے جاتے ہی بچوں سے پوچھا ''ماں کہاں ہے؟'' بچے بڑے حیران ہوئے۔ ایک نے پوچھا۔ ''آپ کون ہیں؟'' ہری موہن نے جواب دیا ''تم اپنے باپ کو نہیں پہچانتے'' بچوں نے شور مچایا۔ ماں

جو آرڈر دینے کے لیے گئی ہوئی تھی، بچوں کے چلاّنے کی آواز سن کر بھاگتی ہوئی آئی۔ کچھ اور لوگ بھی اکٹھے ہو گئے۔ بڑے لڑکے نے ہری موہن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ شخص کہتا ہے میں تمھارا باپ ہوں۔ اُس کی ماں نے آؤ دیکھا تاؤ ہری موہن پر برس پڑی ''تم میرے بچوں کو اِغوا کرنا چاہتے ہو۔ میں ابھی پولیس کو بلاتی ہوں۔'' وہ پولیس کو ٹیلی فون کرنے لگی تھی کہ سرلا شور سن کر وہاں آ گئی۔ اتنے میں لوگوں نے ہری موہن کو پکڑ لیا۔ جب سرلا نے اُن کو بتایا کہ میرے خاوند ہیں۔ انھیں غلطی ہو گئی ہے۔ آپ مجھے معاف کر دیجیے۔'' پہلے تو ماں کو اُس کی بات پر یقین نہیں آیا، مگر جب دو چار لوگوں نے کہا کہ ''بہن جی، ان سے غلطی ہو گئی ہے۔ آپ انھیں معاف کر دیجیے۔'' تو اُس نے جانے دیا۔

ایک شام جب وہ اچانک دفتر سے گھر لوٹا تو دروازہ کھلا تھا۔ وہ سیدھا اندر آ گیا۔ بیٹھک میں ایک پڑوسن خوب سج دھج کر بیٹھی تھی۔ لگتا تھا کسی بارات میں جانے والی تھی۔ اُس کو کسی چیز کی ضرورت ہوئی تو وہ سرلا کے گھر آئی۔ سرلا نے اُسے بیٹھک میں بٹھا دیا اور خود دوسرے کمرے میں جا کر الماری سے کچھ نکالنے لگی۔ اتنے میں ہری موہن اندر آ گیا۔ پڑوسن کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا ''جانِ من، آج تو بڑی سج دھج کر بیٹھی ہو۔ کیا بات ہے؟ کسی پارٹی میں جانا ہے؟ جی کرتا ہے تمھیں چوم لوں۔'' پڑوسن گھبرا گئی۔ مگر اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اپنا منہ دوسری طرف کر لیا۔ مگر اندر سے اُسے فکر ہونے لگی کہ اگروال کوئی ناجائز حرکت نہ کر بیٹھے۔ اُسے محسوس ہوا کہ اگروال نے دن کو پی رکھی تھی۔ تبھی ایسی بہکی بہکی باتیں کر رہا تھا۔ جب اگروال اُس کی طرف اس ارادے سے بڑھا کہ اُسے چوم لے پڑوسن نے زور سے سرلا کو آواز لگائی ''سرلا، جلدی آؤ۔ تمھارا آدمی بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔ لگتا ہے اُس نے پی رکھی ہے۔''

سرلا الماری کو کھلا چھوڑ کر بھاگتی ہوئی آئی۔ پڑوسن کی آواز سن کر اُسے لگا کہ اُس کے خاوند نے کوئی احمقانہ حرکت کی ہے۔ سرلا کو دیکھ کر اگروال کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ اس سے پیشتر کہ اگروال پڑوسن سے معافی مانگتا سرلا سمجھ گئی کہ اُس نے پڑوسن کی

شناخت کرنے میں غلطی کی ہے۔ اُس نے پڑوسن سے کہا" بہن جی، معاف کرنا۔ انھیں کبھی کبھی دورہ پڑتا ہے۔ جب دورہ پڑتا ہے تو ان کو پتہ نہیں چلتا کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔"

ہری موہن شرمندہ ہو کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ پڑوسن کو پھر بھی یقین نہیں آیا۔ اُس دن کے بعد وہ سرلا کے گھر نہیں آئی۔ اُسے ڈر تھا کہ اُسے دیکھ کر اگروال کو پھر دورہ نہ پڑ جائے۔

کسی مرکزی وزیر کی اچانک موت ہونے سے اُس دن گیارہ بجے سب سرکاری دفتر بند کر دیئے گئے۔ اگروال نے سوچا گھر کیا جانا، اچھا موقع ہے۔ کئی دنوں سے بازار کی سیر نہیں کی۔ سیر بھی ہو جائے گی اور بچوں کے لیے چھگن حلوائی کی دُکان سے قلاقند اور کچوڑیاں بھی لیتا جاؤں گا۔ گھومتے گھومتے اُسے بھوک لگ گئی۔ اُس نے ایک چھوٹے سے ڈھابہ سے سبزی کے ساتھ دو پوڑیاں کھائیں اور چائے پی۔ اتفاق سے سرلا بھی اُسی بازار میں کچھ خریدنے کے لیے آئی ہوئی تھی۔ اُس نے اپنے شوہر کو نہیں دیکھا مگر ہری موہن نے اُسے دیکھ لیا۔ گھر میں تو وہ بیوی کی پہچان اُس کی آواز سے کر لیتا مگر بازار میں کیسے کرے۔ اتنے سال ہو گئے تھے مگر اُس کو اپنی بیوی کی گھر سے باہر شناخت کرنے میں اکثر غلطی ہو جاتی تھی۔ اُسے محسوس ہوا وہ اُس کی بیوی ہے مگر پوچھنے سے گھبراتا تھا۔ اگر اُس نے پوچھ لیا اور وہ اُس کی بیوی نہ نکلی تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ وہ پڑوسن والا واقعہ نہیں بھولا تھا۔ وہ اُسی کے پیچھے چلتا گیا۔ اُس نے سوچا موقع دیکھ کر جہاں بھیڑ نہیں ہوگی پوچھ لوں گا۔ بازار کے ایک نکڑ پر زیادہ بھیڑ نہیں تھی۔ سرلا پگڈنڈی پر بیٹھے ایک پھیری والے سے بالوں کو لگانے والا کلپ لے رہی تھی۔ اُس نے سوچا یہ موقع اچھا ہے۔ مگر پھر بھی وہ اُسے سرلا کہہ کر بلانے سے گھبراتا تھا۔ سرلا نے اُسے ابھی بھی نہیں دیکھا کیونکہ وہ کلپ چننے میں مصروف تھی۔ جب وہ اپنے بٹوہ سے پیسے نکال کر دُکان دار کو دینے لگی تو ہری موہن نے آگے بڑھ کر ہاتھ جوڑ کے کہا۔ "معاف کیجیے، بہن جی، لگتا ہے آپ کو پہلے کہیں دیکھا ہے۔"

OO

ہوائی پٹاخہ

سونی پت غلّہ منڈی میں لالہ دگمبر مَل جین اناج کا بہت بڑا بیوپاری تھا۔ بیساکھی کے موقعے پر وہ پنجاب کے زمین داروں اور بڑے بڑے کسانوں سے گیہوں خریدتا تھا اور اپنے گوداموں میں ڈال لیتا تھا۔ چار گوداموں میں سے تین تہہ خانوں کی طرح زمین کے اندر تھے جہاں وہ گیہوں کی بوریاں چھپا کر رکھتا تھا تاکہ اگر کسی وقت سرکار چھاپہ مارے تو اُسے وہ گودام نہ ملیں۔ چوتھا گودام زمین کے اوپر تھا جس میں وہ اُتنا ہی غلہ رکھتا تھا جو اُس کے اسٹاک رجسٹر میں درج تھا۔ دیکھنے میں ویسے سیدھا سادا لگتا تھا مگر تھا کائیاں۔ جب گیہوں کی بازار میں کمی ہوجاتی یا مانگ بڑھ جاتی، وہ دوگنے تگنے داموں پر بیچتا تھا۔ بڑھیا کپڑے پہننے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ کسی اور کام میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ صرف ایک ہی شوق تھا، کھانے کا۔ کھانا اچھا اور لذیذ ہونا چاہیے۔ اُس کی یہ مانگ بیوی پورا کردیتی تھی۔ اُسے بازار سے چٹ پٹی چیزیں منگوانے کی کم ضرورت پڑتی تھی۔ کھانا لذیذ ہونے سے وہ ضرورت سے زیادہ کھالیتا تھا۔ کھا کھا کر اُس کا پیٹ باہر نکل آیا تھا جیسے چھ مہینے کی حاملہ عورت ہو۔ دراصل توندوالے شخص کو لوگ کھاتا پیتا آدمی سمجھتے تھے، مگر اتنا پیسہ ہونے کے باوجود بھی وہ بڑا کنجوس تھا۔

غلّہ منڈی میں جین کی بہت بڑی دُکان تھی جو اُس کے دفتر کا بھی کام دیتی تھی۔ ایک طرف کوئی دوفٹ اونچا تھڑیہ بنا رکھا تھا جس پر ایک گدّا بچھا کر اُس کے اُوپر نرم اور چمکدار قالین ڈال رکھی تھی۔ وہ اُس پر آلتی پالتی مار کر ڈیسک کے پیچھے بیٹھتا تھا۔ کیونکہ اُس کا ہاضمہ

تیز نہیں تھا کہ جو کھالے پچالے۔ اُس کے پیٹ میں ہَوا بھر جاتی تھی۔ وقت وقت پر دباؤ پڑنے سے وہ اپنی بائیں ٹانگ کو اُوپر اُٹھا کر پیچھے سے ہوا چھوڑتا تھا جیسے گاڑی کا ٹائر پنکچر ہو گیا ہو یا جیسے پرانے زمانے میں کوئلہ سے چلنے والا انجن زور سے دُھواں چھوڑتا تھا۔ منڈی کے سب لوگ اُس کی اس عادت سے واقف تھے۔ کئی غلہ فروش اور گاہک اُس کا چپکے چپکے مذاق بھی اُڑاتے تھے۔ عموماً لوگ دو شعر بھی پڑھتے تھے:

لالے کی جو نکلی پُھسکی
دھوتی اپنی جگہ سے کھسکی
جب وہ نکالتا گوز
ٹانگ اُٹھا کر بناتا پوز

ایک بار وہ پارک میں سیر کر رہا تھا۔ ستانے کے لیے ایک بینچ پر آ کر بیٹھ گیا۔ پاس میں کچھ چھوٹے بچے کھیل رہے تھے۔ اچانک لالہ نے اتنے زور سے پاد مارا کہ کئی بچے ڈر کر چلاّنے لگے۔ دو چار گھبرا کر اِدھر اُدھر بھاگ گئے۔ وہ تو وہ بہت سی بچوں کی مائیں اور نوکرانیاں بھی گھبرا کر کانپنے لگیں۔ دگمبر مَل نے جب یہ نظارہ دیکھا تو فوراً وہاں سے کھسک گیا۔ اُسے ڈر لگا کہ کوئی اُسے ڈانٹ ڈپٹ کا کڑوا گھونٹ نہ پلا دے۔

ایسے ہی لالہ کے ساتھ ایک اور واقعہ ہوا۔ وہ ریل گاڑی میں سفر کر رہا تھا۔ گاڑی کا ڈبّہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ جتنے مسافر سیٹوں پر بیٹھے تھے اُس سے کہیں زیادہ کھڑے ہوئے تھے۔ وہ جگہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظر گھما رہے تھے۔ کچھ تو اتنے تیز تھے کہ بیٹھے ہوئے مسافر کو دھکّا دے کر زبردستی اُس کے ساتھ کونے میں بیٹھ جاتے۔ جین اپنی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ موٹا تازہ ہونے کی وجہ سے اُسے پہلے ہی دقت ہو رہی تھی۔ اتنے میں ایک ادھیڑ عمر کا آدمی دھکم دھکا کر کے اُس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ جین کو بڑی کوفت ہوئی۔ اُس نے اعتراض کیا اور دو چار گالیاں بھی دیں۔ مگر مسافر بھی کافی ڈھیٹ تھا۔ وہ وہاں سے نہیں ہلا۔ اچانک جین کو لگا کہ پاد اندھیری سُرنگ سے باہر نکلنے کے لیے زور لگا رہا ہے۔ ڈبہ میں پاؤں رکھنے کی جگہ نہیں تھی۔ مگر وہ اپنے آپ کو نہیں روک سکا اُس نے اتنے زور سے پاد مارا کہ جو مسافر اس

کے ساتھ زبردستی بیٹھ گیا تھا گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ دو چار مسافر جو پاس میں بیٹھے تھے وہ بھی گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔ جین دل ہی دل میں ہنسنے لگا کہ آج اُس کے پاد نے کمال کر دکھایا۔ گھر آ کر بیوی کو سارا واقعہ سنایا۔ وہ بھی ہنسنے لگی۔ جین نے اُس سے کہا۔ ''تم میرے پاد کی نقطہ چینی کرتی ہو، مگر دیکھا گاڑی میں میری پھُسکی کیسے کار آمد ثابت ہوئی۔''

گاڑی میں پاد کے فائدہ سے جین تو خوش تھا، مگر اُس کی بیوی درشنا پر اس کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ رات کو کم از کم چھ سات بار سوئے ہوئے وہ ہوائی چھوڑتا تھا۔ کئی بار تو اتنے زور سے جیسے بادل کی گرج ہو۔ درشنا گھبرا کر اُٹھ بیٹھتی تھی۔ کئی بار وہ بستر سے اُٹھ کر صوفہ پر جا کر لیٹ جاتی تھی۔ آواز تو وہاں بھی آتی تھی۔ مگر فاصلہ ہونے کی وجہ سے اُس کی شدت کم ہو جاتی تھی جو درشنا کے لیے اتنی ناقابلِ برداشت نہیں تھی۔ کبھی سوتے سوتے وہ بڑبڑاتی ''ہے بھگوان کیسے مرد سے پالا پڑا ہے۔ سارا دن کولھو کے بیل کی طرح کام کرتی ہوں۔ رات کو چین سے سو بھی نہیں سکتی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد پچکاری چھوڑتا ہے۔ کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تڑاتڑ بندوق سے گولی نکل رہی ہے۔'' دن بھر کام کر کے رات کو جین بھی اتنا تھکا ہوا ہوتا تھا کہ تکیہ پر سر رکھتے ہی اُسے نیند آ جاتی تھی۔ اُس کو خود پتا نہیں تھا کہ وہ پھلجھڑی چلا رہا ہے یا دھان کوٹ رہا ہے۔ بس اتنا ضرور محسوس کرتا تھا کہ پیچھے سے کچھ خلاصہ ہوا ہے۔ اُس نے دو چار حکیموں سے بھی مشورہ کیا۔ دوا بھی لی، مگر پاد کی بوچھار کو نہ رُکنا تھا نہ رُکی۔ پاد اُس کے باغی ہاضمہ کا حصہ بن گیا تھا۔

اپنے بھتیجے کی شادی پر اُس کے بڑے بھائی نے کہا ''دگمبر جلدی آنا۔ تو بھی ہمارے ساتھ ناچ کرنا۔ خوشی کے موقع پر نہیں ناچے گا تو کب ناچے گا؟'' دگمبر ناچنے سے گھبراتا تھا۔ ایک تو ماشاء اللہ وہ فربہ اندام تھا۔ وہ ڈرتا تھا اگر کہیں گر پڑا تو اُس کی ہڈی پسلی ٹوٹ جائے گی۔ دوسرا یہ کہ اگر ناچتے ناچتے اُس کی ہوا سرک گئی تو براتی ہنسیں گے۔ عورتیں ناک پر ہاتھ رکھ کر چڑائیں گی اور بچے تالیوں کے شور سے آسمان کو سر پر اُٹھا لیں گے۔ ویسے بھی وہ پیٹو تھا۔ شادی بیاہ کے موقع پر میز پر طرح طرح کے کھانے سجے دیکھ کر وہ ضرورت سے زیادہ کھا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ اُس کے لیے چار قدم بھی چلنا دوبھر ہو جاتا تھا۔ وہ ایک بڑی

سی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا جس کی صرف ٹیک تھی بازو نہیں تھے۔ جب اُس کے بھائی نے اُسے بیٹھے ہوئے دیکھا اُس نے دگمبر کو ناچ میں شامل ہونے کے لیے مدعو کیا۔ دگمبر نے کہا ''بھائی صاحب، مجھے ناچنا نہیں آتا۔ آپ مجھے معاف کر دیں تو یہی ٹھیک رہے گا۔ پاس میں کھڑے دوسرے بھتیجے نے کہا ''تاؤ، آؤ نا۔ میں سکھا دوں گا۔ تمھارے ساتھ میں ہوں نا۔''

ایک براتی نے مسکراتے ہوئے کہا ''جین صاحب، آپ ناچیں گے تو آپ کا کھانا بھی ہضم ہو جائے گا۔ چورن کی گولیاں نہیں کھانی پڑیں گی۔''

بھائی اور بھتیجے نے دگمبر کو کرسی سے اُٹھا کر ناچ کرنے والی ٹولی کے بیچ میں لا کر کھڑا کر دیا۔ جب پہلا قدم اُٹھایا دگمبر گرتے گرتے بچا۔ بھتیجے نے کہا ''تاؤ، گھبراؤ نہیں۔ شروع شروع میں ایسا ہوتا ہے۔ جب ایک بار ناچو گے تو کہو گے زندگی بھر ناچتا رہوں۔''

جتنی تیز رفتار سے براتی ناچتے اُتنی تیز رفتار سے ڈھول والے ڈھول بجاتے۔ ناچتے ناچتے ایکدم دگمبر جین کے پیٹ میں ہوا گھمر گھیر کی طرح گھومنے لگی۔ ابھی تک اُس نے ہوا کو اپنے زور سے روک رکھا تھا۔ اب اُسے اور روکنا ناممکن تھا۔ اس نے سوچا شامیانہ کے ایک کونے میں جا کر پٹاخہ چھوڑ کر واپس آ جاؤں گا۔ وہ جلدی سے باہر نکل رہا تھا کہ زور کا دھماکہ ہوا۔ ڈھول والے نے سوچا اس کا ڈھول پھٹ گیا ہے۔ اُس نے ڈھول بجانا بند کر دیا۔ ناچنے والے بھی ناچتے ناچتے رُک گئے۔ کئی براتیوں نے سمجھا برات گھر کے باہر آتش بازی ہو رہی ہے۔ شاید کوئی پھلجھڑی اوپر اُڑنے کی بجائے شامیانہ کو پھاڑ کر نیچے گری تھی۔ جب اُس ہنگامے کا کوئی سراغ نہیں ملا تو لوگ خاموش ہو گئے۔ مگر ایک دس سال کے لڑکے نے جین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''انکل نے پیٹ میں پٹاخے چھپا کر رکھے تھے۔ ایک پٹاخہ پاخانے والے سوراخ سے اتنی تیزی سے نکلا کہ کسی کو پتہ ہی نہیں چلا کہ پھلجھڑی کہاں سے آئی۔''

لدھیانہ سے سردول سنگھ نام کے ایک زمین دار کا جین کو خط آیا کہ اس سال گیہوں کی فصل بہت اچھی ہوئی ہے۔ اگر آپ سارا گیہوں اُٹھانے کا ٹھیکہ لے لیں تو آپس میں بیٹھ کر

بات چیت کر لیتے ہیں۔ جین سردول سنگھ کو جانتا تھا۔ تین چار بار وہ اُس سے کافی مقدار میں گیہوں خرید چکا تھا۔ اُس سے تاریخ مقرر کر کے جین ریل گاڑی میں بیٹھ کر لدھیانے کے لیے روانہ ہو گیا۔ وہ گاڑی شام کو سات بج کر پچاس منٹ پر لدھیانہ پہنچ جاتی تھی۔ اتفاق سے اس دن گاڑی تین گھنٹے لیٹ ہو گئی۔ رات کے دس بج گئے تھے۔ جین نے وہ کاغذ جس پر سردول سنگھ کا پتہ لکھا ہوا تھا ایک رکشا والے کو دکھایا اور پوچھا ''یہاں چلو گے۔''

رکشا والے نے جواب دیا ''ہاں، چلوں گا۔ مگر رات کا وقت ہے پچاس روپے لگیں گے۔''

جین رکشا میں بیٹھ گیا۔ رکشا والا اُس کاغذ پر لکھے پتہ کے مطابق جین کو ایک گھر کے آگے چھوڑ کر چلا گیا۔ جین نے باہر سے گھنٹی بجائی۔ ایک نوجوان سردار نے دروازہ کھولا اور پوچھا ''آپ کون ہیں۔ کس سے ملنا ہے؟''

جین نے جب سردول سنگھ کا نام لیا تو نوجوان نے کہا ''یہاں اس نام کا کوئی شخص نہیں رہتا۔'' جین نے اپنی جیب سے پتہ والا کاغد دکھایا۔ نوجوان نے جواب دیا ''پتہ تو یہی ہے۔ مگر سردول سنگھ نام کا کوئی آدمی ہمارے خاندان میں نہیں ہے۔ یا تو آپ نے صحیح پتہ لکھنے میں غلطی کی ہے یا اُس نے جلدی میں آپ کو غلط پتہ دے دیا۔'' یہ کہہ کر نوجوان اندر چلا گیا اور دروازہ بند کر دیا۔

جین دو تین اور زمین داروں کو جانتا تھا مگر اُس کو کسی کا پتہ یاد نہیں تھا۔ اُس نے سوچا واپس اسٹیشن چلا جاؤں اور سونی پت کی اگلی گاڑی پکڑ لوں۔ جہاں وہ کھڑا تھا وہ علاقہ اتنی آبادی والا نہیں تھا۔ بڑی بڑی کوٹھیاں تھیں جس میں امیر لوگ رہتے تھے۔ اُسے کوئی رکشا نہیں ملی۔ اسٹیشن کافی دور تھا۔ پیدل چل کر جانے کا سوال ہی نہیں اُٹھتا تھا۔ وہ تھوڑا آگے نکلا کہ شاید رکشا مل جائے۔ اتنے میں سڑک کی روشنی غائب ہو گئی۔ وہ گھوم ہی رہا تھا کہ پیچھے سے پولیس کی گشتی جیپ آئی جو اُس کے پاس آ کر رُک گئی۔ ایک پولیس والے نے پوچھا۔ ''تم کون ہو۔ رات کو کیا کر رہے ہو؟''

جین نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''میں سردار سردول سنگھ کا گھر ڈھونڈ رہا

ہوں۔"

پولیس والے نے پوچھا" کیا نمبر ہے؟"

جین نے کہا" لکھا تو تھا مگر جلدی میں غلط لکھ لیا۔"

پولیس والے نے اپنا رعب جھاڑتے ہوئے کہا۔" تم جیسے سینکڑوں لوگوں کو میں نے مرغا بنایا ہے۔تم کس کھیت کی مولی ہو۔ میں تمھاری باتوں میں آنے والا نہیں۔ چلو جیپ میں بیٹھ جاؤ رات پولیس چوکی پر رہو۔صبح ایس.ایچ.او صاحب آ کر تمھارا فیصلہ کریں گے۔"

پولیس والے دگمبر کو جیپ میں بٹھا کر پولیس چوکی لے گئے۔ وہ گھبرایا نہیں۔ رات بسر کرنے کے لیے اُسے اچھا موقع مل گیا۔ وہ ہوٹل میں نہیں رہنا چاہتا تھا جہاں کمرے کا کرایہ بہت زیادہ تھا۔ وہ دے تو سکتا تھا مگر کنجوس تھا۔ پولیس والوں نے اُس کی تلاشی لی۔ اُس کی جیب سے نو سو تیس روپے ملے۔ انھوں نے وہ نقدی اپنے پاس رکھ کر یہ کہا" کل صبح مل جائے گی۔" انھوں نے جین کے پیسوں میں سے باہر کا کھانا منگوایا جو انھوں نے خوب پیٹ بھر کھایا اور جین کو بھی کھلایا۔ اس کے بعد انھوں نے جین کو ایک چھوٹی سے کوٹھری میں بند کر دیا۔کوٹھری کا دروازہ پرانی لکڑی کا ہونے کی وجہ سے ہوا کے ایک جھونکے سے ہلنے لگ جاتا تھا۔ اُس وقت رات کے بارہ بج چکے تھے۔ وہ وہاں سے جا کر پولیس کے احاطہ میں پڑی چار پائیوں پر لیٹ گئے۔ اُن کو نیند آ گئی۔ جین کو ہوا نکالنے کے کب سے ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ اُس نے اتنے زور سے پاد مارا کہ پولیس والے جو بنیان اور نیکر میں سوئے ہوئے تھے، گھبرا کر اُٹھ بیٹھے۔ کیونکہ اُن کو نیند آ رہی تھی۔ انھیں ایسا لگا کہ کسی دہشت گرد نے پولیس چوکی پر بم پھینکا ہے۔ بغیر اِدھر اُدھر دیکھے وہ ڈر کے مارے چوکی سے باہر آ گئے۔ جب وہ دائرلیس سے بم دستہ کو بلانے کی سوچ رہے تھے عین اُسی وقت جین بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس نے زور سے دروازے کو دھکا لگایا۔ قبضے ڈھیلے ہونے کی وجہ سے دروازہ پٹاخ سے گر پڑا جس کا اتنا شور ہوا کہ پولیس والوں کو لگا دہشت گردوں نے انھیں ڈھونڈنے کے لیے گولی چلا دی ہے۔ اتنے میں جین کوٹھری سے نکل کر چوکی کی پچھلی طرف سے ایک چھوٹی سی دیوار کو پھاند کر نکل گیا۔ کیونکہ وہ وزن دار آدمی تھا۔ اُسے سانس لینے میں

وقت ہو رہی تھی۔ اتفاق سے اُس نے جب اپنی آنکھیں اُوپر اُٹھا کر دیکھا تو اُسے سامنے ریلوے اسٹیشن دکھائی دیا۔ مگر اُسے ایکدم خیال آیا کہ اُس کا بٹوا تو پولیس والوں نے نکال لیا تھا وہ ٹکٹ کیسے خریدے گا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ وہ گاڑی میں بغیر ٹکٹ سوار ہو گیا۔ اس کی خوش قسمتی ٹکٹ چیکر نے اُسے نہیں دیکھا۔ اُس نے گھر پہنچ کر راحت کی سانس لی۔

جب بم دستہ کو وائرلیس سے پیغام ملا تو وہ پانچ منٹ میں پولیس چوکی پہنچ گیا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ چوکی صحیح سلامت ہے تو انھوں نے پولیس والوں کے کان کھینچے اور واپس آ گئے۔ جب دستہ چلا گیا تو پولیس والوں کو اچانک دگمبر کا خیال آیا۔ وہ تیزی سے کوٹھری کی طرف گئے جس کا دروازہ ٹوٹا ہوا دیکھ کر وہ سمجھ گئے کہ سالا بھاگ گیا تھا۔ انھوں نے اُسے تلاش کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی اور اگلی صبح ایس ایچ او کو اس بارے میں بتایا۔ صاحب کی ڈانٹ ڈپٹ کھا کر بھی وہ خوش تھے۔ انھوں نے رات کو بغیر کسی کوشش کے جین کی جیب سے نوسوتیس روپے ٹھگ لیے تھے، جس میں سے البتہ انھوں نے پچاس روپے کھانے پر خرچ کر دیئے تھے۔

OO

پھلجھڑی

جھمکی دیوی کا شوہر دینا ناتھ پردیسی آگرہ سے فتح پور سیکری جانے والی سڑک پر آگرہ سے دو میل دُور ایک ڈھابہ چلاتا تھا۔ زیادہ تر گاہک سیلانی تھے۔ کھانے کے علاوہ وہ چائے بھی بیچتا تھا۔ کھانے سے زیادہ اُس کی چائے مشہور تھی۔ جو بھی ایک بار اُس کے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے پیتا واہ واہ کر اٹھتا۔ پینے والے کو ایسا لگتا تھا ساری تھکاوٹ دُور ہوگئی ہے۔ دماغ تر و تازہ ہوگیا ہے۔ مزا آ گیا ہے۔ آس پاس کے چائے بیچنے والے اُس سے خار کھاتے تھے۔ جس نے دینا ناتھ کے ڈھابے کی چائے پی لی وہ دوسرے ڈھابہ کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔ ایک دُکان دار کو شک ہوا کہ دینا ناتھ ضرور چائے میں کچھ ملاتا ہے۔ اُس کی شکایت پر محکمہ خوراک نے چائے کا نمونہ لیبارٹری میں جانچ کروانے کے لیے بھیجا۔ جانچ کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ چائے کے ساتھ تھوڑی سی مقدار میں افیم اُبلتے پانی میں ڈال دیتا ہے۔ دینا ناتھ کو اس کی بھنک پڑ گئی۔ اس سے پہلے کہ محکمہ اُس کے خلاف کوئی قانونی کارروائی کرتا دینا ناتھ اپنا بوریہ بستر اُٹھا اور بیوی بچوں کو ساتھ لے کر دہلی کے پہاڑ گنج علاقے میں آ گیا۔ اُس نے ایک چھوٹا سا ریستوران کھولا جو خوش قسمتی سے چل پڑا۔ شروع شروع میں جھمکی بھی اُس کی مدد کرتی تھی۔ مگر جب کام چل پڑا تو اُس نے آنا چھوڑ دیا۔ دہلی آنے سے پہلے وہ دُبلی پتلی معمولی سے عورت لگتی تھی۔ ایک سال کے اندر اُس کا وزن بڑھ گیا اور چہرے پر نکھار آ گیا۔ ٹھمک ٹھمک کر چلنے لگی۔ میک اَپ کرنے اور زیور پہننے سے وہ

اب عمر سے دس سال کم لگتی تھی۔ اُس کی سب پرانی عادتیں بدل گئیں مگر چغل خوری کی عادت نہیں گئی۔ چغل خوری میں نہ صرف اُس کو مزا آتا تھا بلکہ اُسے فخر بھی ہوتا تھا۔ اِدھر کی بات اُدھر اور اُدھر کی بات اِدھر۔ من گھڑت کہانیاں بنانے میں سارے محلے میں مشہور تھی۔ پہاڑ گنج میں اُس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔

چھ مہینے کے اندر دینا ناتھ نے پہاڑ گنج میں ایک ہوٹل کھول لیا۔ اگلے سال اُس نے دو طعام گاہ خرید لیے۔ جھمکی دیوی کے تو وارے نیارے ہو گئے۔ صرف اُس کو ایک شکایت تھی۔ جتنا پیسہ اُس کے پاس اب تھا اگر اتنا جوانی میں ہوتا تو زندگی کا لطف کچھ اور ہی ہوتا۔ وہ پچاس سال کی عمر میں کتنا بھی بن ٹھن لے، بھڑ کیلے کپڑے پہن لے، زیورات سے خود کو لاد دے اور بیوٹی پالر سے بال بنوا لے، گزری ہوئی جوانی پاس نہیں آ سکتی تھی۔ اُسے رنگ برنگ کپڑوں میں دیکھ کر ایک بار ایک پڑوسن نے آواز کسی جب وہ اُس کے گھر کے آگے سے گزر رہی تھی۔ ''بوڑھی گھوڑی لال لگام''۔

جھمکی نے سن لیا۔ پڑوسن کے پاس آ کر غصّے سے کہنے لگی۔ ''کیا کہا تم نے؟''

پڑوسن نے جواب دیا ''تم نے کیا سنا؟''

جھمکی نے برانگیختہ کہا ''تو مجھے لال لگام والی گھوڑی کہتی ہے؟''

پڑوسن نے بات کو توڑ موڑ کر کہا ''تو کیا ہوا؟ میں نے تو تمھاری تعریف کی ہے۔ لال لگام والی گھوڑی تو بہت مہنگی ہوتی ہے۔''

جھمکی اتنا پڑھی لکھی نہیں تھی کہ ہر بات کا مطلب سمجھ سکے۔ اُس کے پاس خالی وقت بہت ہوتا تھا، یا تو وہ بازار چلی جاتی یا کسی پڑوسن کے پاس آ کر بیٹھ جاتی۔ بیٹھے بیٹھے وہ کسی نہ کسی کی چغلی کھاتی رہتی۔ وہ پیٹھ پیچھے برائی کرنے سے بھی نہیں چوکتی تھی۔ بدگوئی یا کسی پر خواہ مخواہ کیچڑ اُچھالنا اُس کے خصلت تھی۔ ایک روز وہ اپنی پڑوسن تلسی سے کہنے لگی۔ ''بہنا، اپنے چھوٹے لڑکے کا بیاہ کر دے۔ جوان ہو گیا ہے۔ مجھے گھور گھور کر دیکھتا ہے۔''

تلسی نے اُسے معقول جواب دیا۔ ''تو کیا حُور پری ہے۔ بناؤ سنگھار کر کے اپنے

آپ کو رانی پدمنی سمجھتی ہے۔ گھر جا کر ذرا آئینہ میں اپنی شکل تو دیکھ۔"

ایسے ہی ایک دن وہ نندرانی پڑوسن سے کہنے لگی۔"بہنا، تیرا آدمی ہر رات گھر دیر سے آتا ہے۔ کہیں وہ......"

نندرانی نے ٹوکتے ہوئے کہا"تو اپنے مرد پر نظر رکھ۔ میں نے سنا ہے ہوٹل میں ننگی لڑکیوں کے ناچ کرواتا ہے۔ گاہکوں کو لڑکیاں مہیا کرتا ہے۔"

جھمکی کو یہ جواب بہت بُرا لگا۔ وہ اُٹھ کر چلی گئی، مگر وہ خاموش رہنے والی نہیں تھی۔

اگلے دن جھمکی نشا پڑوسن سے کہنے لگی۔"نندرانی کا شوہر ہر روز رات کو بہت دیر سے آتا ہے۔ کبھی کبھی تو دو تین بج جاتے ہیں۔ گھر پہنچ کر اتنی زور سے گھنٹی بجاتا ہے کہ ہماری نیند کھل جاتی ہے۔ نہ جانے کیا کرتا ہے؟"

نِشا اور نندرانی کی آپس میں نہیں بنتی تھی۔ مزا لینے کے لیے اُس نے کہا"ہاں بہن نہ جانے اتنی رات گئے کہاں سے آتا ہے۔ ویشیا کے کوٹھے پر جاتا ہوگا یا جوا کھلتا ہوگا۔ کوئی نہ کوئی عیب تو ضرور ہے۔"

نِشا کا جواب سن کر جھمکی کا حوصلہ بڑھ گیا کہنے لگی۔"میں نے جب پوچھا تو گرم ہوگئی۔ بکنے لگی گندی گالیاں جو شاید مرد بھی نہیں دیتے۔ میں چپ کر کے آگئی۔ اب نہ جاؤں دوبارہ اُس کے گھر۔" مگر جھمکی نے نندرانی کے گھر جانا بند نہیں کیا۔ نندرانی جانتی تھی کہ جھمکی پھاپاکُٹنی ہے۔ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر اُسے ٹالنے کی کوشش کرتی، مگر جھمکی ڈھیٹ تھی۔ کہیں سے اُس کے کان میں بھنک پڑگئی کہ چنکی پڑوسن نے پنڈت رادھورام سے اپنے لڑکے کی جنم پتری بنوائی ہے۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ جنم پتری میں کیا لکھا ہے۔ مگر اپنی زبان درازی کو برقرار رکھتے ہوئے اُس نے پڑوسن لتا سے کہا"بہن، میں نے سُنا ہے چنکی نے اپنے نئے بچّے کا زائچہ بنوایا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ بچہ ماں باپ کے لیے طوفان ثابت ہوگا۔ بُری صحبت میں پڑ کر گندے کام کرے گا۔ چنکی اور اُس کا خاوند دونوں نیک ہیں۔ پر لڑکا کیوں خراب نکلا بھگوان ہی جانے۔ پنڈت جی نے تو صلاح دی ہے کہ بُرے وقت کو ٹالنے کے

لیے ابھی سے اکیس دن کا پاٹھ پوجا کروانا شروع کروادو۔"

لتا نے پوچھا "تجھے کس نے بتایا؟"

جھمکی نے بے ڈھنگا جواب دیا "پنڈتانی کسی سے کہہ رہی تھی۔ اتفاق سے میں اُدھر سے گزری میرے کانوں میں آواز پڑگئی۔ ساری بات تو جنم پتری پڑھنے سے پتا لگے گی۔" تھوڑی سانس لے کر پھر بولی۔"میں بھی کتنی بری ہوں جو دوسروں کی باتیں سنتی ہوں۔ مگر بہن، میں نے جان بوجھ کر نہیں سنی۔ میرے کان میں پڑگئی تو کیا کرتی۔"

بندیا کے لڑکے کی شادی ہونے والی تھی۔ اُس نے جھمکی اور دینا ناتھ کو بھی شادی کا کارڈ بھیجا۔ شادی سے دو دن پہلے جھمکی اپنی پڑوسنوں سے پوچھنے لگی۔"بہن، سہرے کے وقت کیا دوگی؟"

اُس نے جواب دیا "میں تو ایک سو ایک دینے کی سوچ رہی ہوں۔ تمھارا کیا خیال ہے؟"

جھمکی بولی "ایک سو ایک سے کیا ہوتا ہے۔ مہنگائی کا زمانہ ہے۔ میرے خیال میں کم از کم دو سو ایک ہونے چاہئیں۔"

دوسری پڑوسن نے جھمکی سے پوچھا "تم کیا دوگی۔"

جھمکی نے جواب دیا۔"بہن، بندیا پرانی پڑوسن ہے میں تو پانچ سو ایک دوں گی۔ تمھاری مرضی۔"

سہرے کے وقت جھمکی نے بندیا کے ہاتھ میں پانچ سو ایک روپے پکڑا دیئے۔ سو سو کے پانچ نوٹ اور ایک روپے کا سکہ۔ بندیا نے ایک سو ایک رکھ لیے اور چار سو واپس جھمکی کو دے دیئے۔ جھمکی نے ایک بار ہلکا سا اصرار کر کے نوٹ واپس لے لیے۔ جھمکی دل ہی دل میں کہنے لگی۔"اچھا ہوا بندیا نے ایک سو ایک رکھا ویسے اس سے زیادہ بنتے بھی نہیں تھے۔ اس کے علاوہ جب دُلہن کو دیکھنے جاؤں گی تب بھی تو کچھ دینا پڑے گا۔"

اگلے دن لتا نے پوچھا"بہن تم نے کیا دیا تھا؟"

جھمکی نے کہا'' دیئے تو میں نے پانچ سو ایک تھے مگر اُس نے ایک سو ایک رکھے، چار نوٹ سو سو کے واپس کر دیئے۔''

لتا نے حیرانی سے پوچھا۔'' پر تم نے تو لفافے میں بند کر کے دیئے ہوں گے۔ کیا اُس نے لفافہ کھول کر دیکھا تھا؟''

جھمکی نے بڑے انداز میں کہا'' بہن، تو تو جانتی ہے کہ میرا آدمی کتنا مصروف رہتا ہے۔ گھر کا کوئی بھی کام ہو آخری وقت پر کرتا ہے۔ وہ بازار سے خالی لفافہ لانا بھول گیا۔ میں نے بنا لفافے میں ڈالے اُس کے ہاتھ میں پکڑا دیئے۔ مجھے کیا معلوم تھا چار سو واپس کر دے گی۔ نہیں تو میں دُرگا پڑوسن سے خالی لفافہ مانگ لیتی۔''

بندیا کی بہو ایشا بی. اے پاس تھی۔ مگر بندیا کا لڑکا منوہر کالج میں دو سال پڑھنے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ کام میں لگ گیا۔ اُسے کالج کی پڑھائی میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جب دُلہن کو گھر لایا گیا۔ رواج کے مطابق محلے کی عورتیں اُسے دیکھنے کے لیے آئیں۔ ہر عورت نے دُلہن کو کچھ نہ کچھ نقدی یا جنس کی صورت میں دیا۔ جھمکی نے دُلہن کے سر پر ایک سو کا نوٹ گھما کر اُس کے ساتھ بیٹھی ساس کو پکڑا دیا اور ہلکا سا منہ بنا کر بندیا کے پاس آ کر کہنے لگی۔'' بہن، یہ تو نے کیا کیا؟ سونے کی تھالی میں چاندی کی میخ لگا دی۔'' سونے کی تھالی سے اُس کا مطلب منوہر تھا اور چاندی کی میخ سے اُس کا مطلب ایشا تھا۔ یعنی جہاں منوہر سمجھ دار اور اچھی ڈیل ڈول والا تھا وہاں ایشا معمولی سے لڑکی لگتی تھی۔ جھمکی کا اس طرح آواز کسنا ایشا نے سن لیا۔ اُسے بُرا لگا۔ جہاں سب عورتیں اُس کی تعریف کر رہی تھیں، جھمکی نے اُس کی مذمت کیوں کی۔ اس وقت تو وہ چپ کر گئی۔ کچھ دنوں کے بعد جب وہ اپنی ساس سے گھل مل گئی تو ایک دن اُس نے پوچھا'' وہ عورت کون تھی جو کہہ رہی تھی کہ آپ نے سونے......''

ساس نے بات کو کاٹتے ہوئے کہا۔'' بیٹی، بھول جا اُسے۔ بُھتنی ہے۔ اُس چڑیل کی باتوں میں کبھی مت آنا۔'' ایشا سمجھ گئی مگر اُس نے تہیہ کر لیا کہ وہ جھمکی کو سبق سکھا کر چھوڑے

گی۔

ایک دن اتفاق سے جب جھمکی بندیا سے بات کر رہی تھی۔ منوہر اور ایشا کمرے کے اندر آئے۔ منوہر کو دیکھ کر جھمکی نے سر کا پلّو نیچا کر لیا جیسے کئی عورتیں دکھاوے کے لیے کرتی ہیں کہ وہ کتنی پاک باز ہیں۔ ایشا سے نہ رہا گیا۔ اُس نے چٹکی لیتے ہوئے کہا "نو سو چوہے کھا کر بلّی حج کو چلی۔"

ایشا کی پھبتی جھمکی کو سمجھ نہیں آئی۔ اُس نے بندیا سے پوچھا۔ "بہو کیا کہہ رہی ہے؟"

بندیا نے پٹاک سے جواب دیا "یہ کہہ رہی ہے تم اپنے آپ کو ستی ساوتری سمجھتی ہو مگر اصل میں ہو پھلجھڑی۔"

ابھی بھی یہ بات اُس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ ایشا نے کہا۔ "ماسی، میں سمجھاتی ہوں۔ پھلجھڑی کا یہاں مطلب ہے تم جہاں بھی جاتی ہو کوئی نہ کوئی شگوفہ چھوڑتی ہو۔ یعنی آگ لگاتی ہو۔"

جھمکی کو یہ بات ناگوار گزری۔ ماتھے پر شکن لاتے ہوئے بندو سے کہنے لگی۔ "بہن، اپنی بہو کو قابو میں رکھ۔ بہت منہ پھٹ ہے۔ چھوٹے بڑے کسی کا لحاظ نہیں کرتی۔ ایک دن تجھے ناکوں چنے چبوائے گی۔"

ایشا نے چڑاتے ہوئے کہا "ماسی، اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ہاں ایک دن تجھے ناکوں......"

بندیا نے ٹوکتے ہوئے کہا "بیٹی بس کر، بہت ہو گیا۔" جھمکی ناراض ہو کر وہاں سے چلی گئی۔

ایک دن اتفاق سے جب جھمکی کہیں جا رہی تھی۔ ایشا نے اُسے کھڑکی سے دیکھ لیا۔ جھمکی نے ہاتھ میں ایک کٹوری پکڑی ہوئی تھی۔ اُس نے کہا۔ "ماسی رام رام کہاں سے آ رہی ہو؟ یہ ہاتھ میں کیا ہے؟"

جھمکی نے لاپرواہی سے جواب دیا "للیو کے گھر سے دودھ جمانے کے لیے کھٹاس

لائی ہوں۔"

شام کو ایشا نے لیلو سے کہا: "آنٹی، جھمکی ماسی تمھاری بُرائی کر رہی تھی۔ کہہ رہی تھی کہ کھٹاس لینے گئی تھی۔ اتنی تھوڑی دی کی دہی جمی ہی نہیں۔ بڑی کنجوس ہے۔ ذرا سی دہی دینے میں بھی اُس کا دل دھک دھک کرتا ہے۔"

لیلو نے جواب دیا "بیٹی، تو اُس کی باتوں میں مت آیا کر۔ بڑی چالاک اور چغل خور ہے۔"

ایشا نے بات کو لمبا کرتے ہوئے کہا۔ "مگر آنٹی یہ بات اچھی تو نہیں ہے۔ بڑوں کی چغلی کھانا ٹھیک نہیں ہے۔"

کیونکہ واقعی جھمکی لیلو کے گھر سے کھٹاس لے کر آئی تھی اور وہ جانتی تھی کہ جھمکی بڑی خراب عورت ہے۔ اس کو ایشا کی بات پر یقین آ گیا۔ اُس دن کے بعد جب کبھی جھمکی لیلو کے گھر جاتی وہ اُسے کسی نہ کسی بہانے ٹال دیتی۔ جھمکی سمجھ گئی ایشا نہلے پر دہلا ہے۔ اُس سے پنگا مول لیتا اپنی بے عزتی کروانی ہے۔ وہ کوشش کرتی کہ ایشا سے آمنا سامنا نہ ہو، مگر اُس نے اپنی عادت نہیں چھوڑی۔ ایک دوپہر کچھ عورتیں دھوپ میں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ اتنے میں جھمکی بھی آ گئی۔ ایشا نے اُسے دیکھ لیا۔ وہ چپکے سے دیوار کی اوٹ میں کھڑی ہو کر اُن کی باتیں سننے لگی۔ جھمکی نے کہا "کل میں لیلو کے گھر گئی تھی۔ آدھ گھنٹہ کھڑی رہی۔ ایسی بے مروّت عورت ہے کہ پانی تک نہیں پوچھا۔ بیٹھنے کے لیے تو کیا کہنا تھا۔"

ایشا نے یہ بات سن لی اور اگلے دن لیلو سے جا کر سنائی۔ ماتھے پر سلوٹ لاتے ہوئے لیلو نے کہا "مردود ہے۔ میں نے اُسے دودھ کی لسّی پلائی اور وہ کم بخت کہتی ہے میں نے پانی تک نہیں پوچھا۔ اب تو میں اُس سے واقعی پانی تک نہیں پوچھوں گی۔"

ایشا کے مداخلت، چالاکی اور سوجھ بوجھ سے محلے کی تقریباً سبھی عورتیں جھمکی سے ناک بھوں چڑھانے لگیں۔ اب وہ محلے میں کم دکھائی دیتی۔

ایک صبح جب جھمکی کہیں جا رہی تھی ایشا نے اُسے کھڑکی سے دیکھ لیا اور دروازہ کھول کر

باہر آ گئی۔ جوں ہی وہ ایشا کے آگے تیزی سے نکلی، اُس نے زور سے کہا ''ماسی، رام رام اتنی سویرے کہاں جا رہی ہو؟ خیریت تو ہے؟

جھمکی رُک گئی اور کہنے لگی ''سب ٹھیک ہے''

جب وہ چلنے لگی تو ایشا نے کہا ''ماسی، تو آج کل کم نظر آتی ہے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔''

جھمکی نے بے تابانہ جواب دیا۔ ''ہاں ٹھیک ہے۔ گھر میں اتنے کام ہوتے ہیں کہ باہر نکلنے کی فرصت ہی نہیں ہوتی۔''

ایشا نے لبوں پر مسکراہٹ کھلاتے ہوئے کہا ''مگر ماسی، میں نے تو سنا ہے کہ تمھارے گھر میں دو نوکرانیاں، دو نوکر، ایک باورچی اور ایک مالی ہیں۔ تمھیں کیا کام کرنا پڑتا ہے؟''

جھمکی کا مزاج بگڑا ہوا تھا۔ منہ بسورتی اور بڑبڑاتی ہوئی تنک مزاجی سے بولی ''سب کے سب مر گئے ہیں۔''

OO

جہیز

ہندوستان میں جہیز کا رواج کب اور کیوں شروع ہوا ٹھیک سے کہنا مشکل ہے۔ لگتا ہے راجوں مہاراجوں اور سلطنت میں اونچے عہدے والے جو شاہی خاندان اور حکومت سے جڑے ہوئے تھے اور ریاستوں کے دیوان، امیر زمین دار اور ایسے ہی کچھ ساہوکاروں سے جہیز کا رواج شروع ہوا۔ آہستہ آہستہ یہ رواج شاہی تخت سے بغیر سیڑھی اُترے سارے ملک میں وبا کی طرح پھیل گیا۔ یہاں تک کے چھوٹے چھوٹے دُکان دار، کاشت کار، کاریگر، فوج کے سپاہی شاہی عدالت کے کارندے اور دربان اور تو اور عام پیشہ کے لوگ اس وبا کی گرفت میں آ گئے۔ اس کا ایک بڑا نتیجہ یہ نکلا کہ بہت سے ماں باپ لڑکی پیدا ہونے پر اُس کا گلا گھونٹ دیتے تھے یا اُس کو افیم چٹوا دیتے تھے جس سے اُس کی فوراً موت ہو جاتی۔ کہتے ہیں جہیز کے کچھ مقصد بھی تھے۔ کیونکہ رسم و رواج کے مطابق لڑکی کو باپ کی جائداد سے محروم رکھا جاتا تھا اور جہیز کی صورت میں اُس کو موروثی جائداد میں سے حصہ یکمشت دے دیا جاتا تھا۔ دوسرا مقصد یہ تھا اگر کسی وجہ سے لڑکا اپنے والدین سے علیحدہ ہو جائے یا اُسے گھر سے نکال دیا جائے تو میاں بیوی کے پاس گھر کی ضروریات کا سارا سامان ہونا چاہیے تا کہ اُنھیں نیا گھر بسانے میں کوئی دقت نہ ہو۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جہیز کی ماہیت سے لڑکی والوں کے معیارِ فراخ دلی کا بھی نقشہ نمایاں ہو جاتا تھا جو لڑکے والوں کے لیے یا تو باعث فخر تھا یا باعثِ ملال۔ شادی سے دو دن پہلے لڑکی والوں کے گھر میں جہیز کی

نمائش کی جاتی تھی اور شادی کے بعد وہی نمائش لڑکے والوں کے گھر میں لگائی جاتی تھی تا کہ رشتے دار اور اڑوس پڑوس کے لوگ جن میں عورتوں کی شمولیت زیادہ تھی جہیز کو دیکھ کر اپنی رائے کا اظہار کر سکیں۔ جتنی زیادہ تعریف ہوتی لڑکے کے ماں باپ اتنا زیادہ خوش ہوتے کہ کیا ہاتھ مارا ہے۔ شروع میں لڑکی والے جو کچھ جہیز میں دیتے تھے لڑکے والے خوشی سے قبول کر لیتے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ اب جہیز کی مانگ ہونے لگی یعنی جہیز میں کیا کیا ہونا چاہیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو ماں باپ لڑکے والوں کی مانگ پوری کر سکتے تھے ان کی لڑکیاں زیادہ وقت تک کنواری گھر میں نہیں بیٹھی رہتی تھیں اور جو ماں باپ جہیز نہیں دے سکتے تھے یا لڑکے والوں کی مانگیں پوری نہیں کر سکتے تھے اُن کی لڑکیاں یا تو عمر بھر کنواری رہ جاتیں یا گھر سے بھاگ جاتیں۔ کئی راجوں مہاراجوں کے حرم میں پہنچ جاتیں جہاں اُن کی زندگی آرام سے کٹ جاتی چاہے، وہ جنسی ہوس پورا کرنے کے لیے تڑپتی رہتیں۔ ایک مہاراجہ کتنی لڑکیوں کی تسلی کر سکتا تھا۔

جہیز کی بات ابھی چھوڑیے۔ اس موضوع پر گھوم گھام کے پھر آئیں گے۔ چلئے پہلے آپ کو لکشمی نرائن مندر لے جاتے ہیں جو بھاگل پور کا خوبصورت عالیشان مندر مانا جاتا ہے۔ اس کو بنانے میں سیٹھ نرائن داس کی آدھی سے زیادہ شرکت تھی۔ صبح پانچ سے سات بجے تک مندر کے کیواڑ کھلے رہتے تھے تا کہ عقیدت مند عبادت کر سکیں۔ کوئی چھ بجے کے لگ بھگ سیٹھ نرائن داس اور اُس کی بیوی لکشمی دیوی وہاں آتے تھے۔ اُس مندر کے باہر ایک دُرگا نام کا فقیر ہاتھ میں کشکول لے کر کھڑا رہتا تھا۔ وہ کوئی چالیس برس کا تھا، مگر بکھرے مٹیالے بال، خمناک آواز، گندہ چہرہ، پھٹے پرانے کپڑے اور گھسی پٹی جوتی کے ساتھ وہ پچاس کا لگتا تھا۔ فقیر عمر میں جتنا بڑا ہوگا لوگ اُس پر اُتنا ہی زیادہ ترس کھائیں گے۔ دو گھنٹے کے اندر کافی پیسے جمع ہو جاتے تھے۔ کبھی کبھی عقیدت مند اُسے کوئی کپڑا، کمبل، پرانا جوتا وغیرہ بھی دے دیتے تھے۔ مندر سے نکل کر بہت سے لوگ اپنے پرشاد کا کچھ حصہ اُسے بھی پکڑا دیتے تھے۔ کیونکہ وہ اتنا کھا نہیں سکتا تھا اس لیے وہ کھانے کا سامان ایک بڑے سے کمنڈل

میں جمع کرتا رہتا تھا جو وہ اپنے گھر لے جاتا تھا۔ ویسے تو وہ اچھا بھلا تھا، مگر جب وہ مندر بھیک مانگنے کے لیے آتا تو آنکھیں بند کر لیتا تھا تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ وہ اتنا بوڑھا ہے کہ اس کی بینائی چلی گئی ہے۔ مگر ایک بار دو منچلوں کو شک ہوا۔ ایک دن انھوں نے شرارت کی۔ اس کے کشکول سے دو سکّے اُٹھا لیے۔ دُرگا کو بھنک لگ گئی۔ اُس نے اپنی آنکھوں کے پٹ پوری طرح سے کھول دیئے اور اُن سے کہنے لگا ''بابو جی، یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ آپ غریب آدمی کو لوٹ رہے ہیں۔''

ایک نے مسکراتے ہوئے طنز کے ساتھ کہا ''تو تو کہتا ہے کہ تمھیں تقریباً کچھ دکھائی نہیں دیتا۔''

دُرگا نے عاجزانہ آواز میں جواب دیا ''بابو جی، پیٹ کے لیے کئی ناٹک کرنے پڑتے ہیں۔''

مندر میں مانگنے کے علاوہ وہ اور کوئی کام نہیں کرتا تھا اور نہ ہی شاید اُسے ضرورت تھی۔

دُرگا کا گھر شہر سے باہر کوئی دو کلومیٹر دُور تقریباً غیر آبادی والے علاقے میں تھا جہاں پڑوس میں کچھ اور فقیر بھی رہتے تھے۔ اُس ایک کمرے والے مکانوں کے مجموعہ کو فقیروں کی بستی کہتے تھے جس کا کوئی نام نہیں تھا۔ وہاں کوئی شخص کم ہی جاتا تھا۔ وہ بستی نہ تو سڑک کے نزدیک تھی اور نہ ہی کسی گاؤں میں پیدل جانے والوں کے راستے میں آتی تھی۔ فقیر بھی نہیں چاہتے تھے کہ اُن کی سکونت کا کسی کو پتہ چلے۔ سب کے پاس تھا تو ایک ہی کمرہ جو باہر سے بوسیدہ اور مٹیالا لگتا تھا مگر اندر پکّا اور مضبوط تھا۔ کمرہ کافی بڑا تھا جسے ہر فقیر خاندان نے اپنے طریقے سے آراستہ کر رکھا تھا۔ گھر آکر درگا نہا دھو کر صاف ستھرے کپڑے پہن لیتا تھا۔ ریڈیو پر گانے لگا کر وہ ناشتہ کرتا تھا۔ پیسہ تو بہت تھا مگر اُسے کیسے خرچ کیا جائے۔ وہ لوگ اچھے کپڑے پہن کر باہر نکلنے سے ڈرتے تھے، کہیں اُن کی فقیری کی پول نہ کھل جاتے۔ تاہم کبھی کبھی چار پانچ فقیر مل کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ڈھنگ کے صاف چمکیلے کپڑے پہن کر جس سے اُن کی فقیری کے کوئی آثار نمایاں نہ ہوں، وہ ایک کلومیٹر دُور سڑک کے کنارے

ایک ڈھابے میں بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے اور پاس کے ایک چھوٹے سے بازار میں جا کر کچھ خریداری بھی کرتے تھے۔ مگر جو کچھ وہ لاتے تھے گھر میں محدود جگہ ہونے کی وجہ سے اُسے جمع کرتے رہتے تھے۔ دُرگا اپنی بیوی پاروتی اور ایک لڑکی آرتی کے ساتھ رہتا تھا۔ آرتی اکلوتی اولاد تھی۔ مندر سے آنے کے بعد دُرگا کے پاس کافی فالتو وقت ہوتا تھا۔ اس نے آس پاس کی خالی زمین کے ایک ٹکڑے میں سبزیاں اُگانی شروع کر دی تھیں۔ جب سبزی ضرورت سے زیادہ ہوتی تو وہ پاروتی سے کہتا "جا، انھیں بازار بیچ آ"۔ کبھی کبھی وہ خود بھی چلا جاتا تھا۔ مگر اُس علاقے میں سبزی بیچنے بھول کر بھی نہیں جاتا تھا جہاں وہ بھیک مانگتا تھا۔

جیسے ہر لڑکی کے ماں باپ کو اُس کی شادی کی فکر رہتی ہے ایسے ہی دُرگا اور پاروتی کو آرتی کی فکر ستانے لگی۔ عموماً وہ لوگ بارہ تیرہ سال کی عمر میں لڑکی کی شادی کر دیتے تھے۔ کیونکہ دُرگا کے رہنے کا معیار بستی کے دیگر فقرا سے اونچا تھا اس لیے وہ بستی سے باہر کسی اچھے گھر کی تلاش میں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ شادی کے بعد آرتی کو بھیک نہ مانگنی پڑے۔ آرتی دیکھنے میں اچھی اور چنچل تھی۔ بستی کے دو تین لڑکوں کے ماں باپ نے دُرگا کو شادی کی پیشکش کی۔ اُنھیں دُرگا یہ کہہ کر ڈال دیتا تھا۔ "ابھی آرتی عمر میں چھوٹی ہے۔" بستی کے باہر اُس نے دو چار گھر دیکھے، لڑکوں کے والدین سے بات چیت بھی کی مگر بات نہیں بنی۔ سب جہیز کی مانگ کرتے تھے وہ جانتے تھے کہ دُرگا ایک مالدار فقیر ہے۔ گھر میں بجلی لگی ہوئی ہے۔ بجلی سے چلنے والا چولھا ہے۔ اچھے اچھے برتن ہیں۔ نفیس عمدہ کمرے ہیں۔ نقدی اور چاندی بھی ہے۔ اُن لوگوں نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ اُس نے نقدی اپنے مکان کے اندر زمین میں دبا رکھی ہے۔ اُسے چوری کا ڈر تو نہیں تھا مگر اُسے سمجھ نہیں آتی تھی کہ اتنا پیسا کیسے خرچ کرے۔ وہ جہیز تو دے سکتا تھا مگر اُس کو ڈر تھا اگر کسی نے یہ خبر پھیلا دی اور وہ خبر پولیس والوں تک پہنچ گئی تو وہ خواہ مخواہ میں دَھرا جائے گا۔ جب دُرگا نے محسوس کیا کہ جہیز دیئے بغیر کوئی بھی اُس کی لڑکی کو بہو بنانے کے لیے تیار نہیں ہے۔ وہ فکر میں پڑ گیا۔ جوان لڑکی کو گھر میں کتنی دیر بٹھا سکتا تھا۔ وہ کسی رشتہ دار سے صلاح مشورہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سب جانتے تھے کہ اُس

کے پاس کافی مال ہے۔ جہیز کی بات چلے گی تو اُن کو پتہ لگ جائے گا کہ میں زمین کے اوپر کتنا ہوں اور زمین کے اندر کتنا۔ پھر کہیں وہ اُس سے کچھ مانگ نہ بیٹھیں۔ اُس نے پاروتی سے صلاح کر کے یہ فیصلہ لیا کہ وہ آرتی کا بیاہ کسی اچھے لڑکے سے کر دیں گے۔ جو جہیز مناسب ہے وہ چپکے سے دے دیں گے۔ اُس کی نمائش نہیں کریں گے۔ اگر وہ زیادہ مانگیں گے تو ہاتھ جوڑ لے گا۔ اچانک اُسے خیال آیا کہ ویرو جو اُسی بستی میں رہتا تھا، اُس کا باپ نہیں تھا۔ ماں کے ساتھ رہتا تھا۔ لڑکا اُس کو پسند تھا۔ اُس نے سوچا اُس کی ماں کو تھوڑے سے پٹانے میں آسانی رہے گی۔ پھر بھی ایک مسئلہ تھا۔ وہ اپنی لڑکی کی شادی کسی بھکاری سے نہیں کرے گا۔ چاہے وہ خود بھکاری تھا مگر حقیقت میں اُسے اپنا پیشہ پسند نہیں تھا۔ خیرات مانگتے مانگتے اُسے کئی سال ہو گئے تھے۔ مفت کی روٹی کھانے کا وہ عادی ہو گیا تھا۔ کچھ نہ کچھ تو نظر انداز کرنا پڑے گا۔ یا فقیری کا پیشہ یا جہیز نہ دینے کا اڑیل پن۔ اس کے پاس ویرو کے علاوہ اور کوئی ممکن یا آسان چارہ نہیں تھا۔ چاروناچار اُسے ویرو کے پاس جانا پڑا۔ اُسے جہیز کا لالچ دے کر ہتھے چڑھا لیا مگر ویرو نہیں مانا۔ تھا تو وہ فقیر مگر تھا بہت چالاک۔ وہ جانتا تھا کہ بستی میں دُرگا سب سے زیادہ امیر فقیر ہے۔ وہ سودے بازی پر اُتر آیا۔ دُرگا کی مشکلیں کم ہونے کی بجائے بڑھ گئیں۔ سوچ سوچ کر اُس کا دماغ چکرا گیا۔ مجبور ہو کر اُس نے ویرو کی مانگ پوری کرنے کا فیصلہ کر لیا مگر اس شرط پر کہ ویرو آرتی سے بھیک نہیں منگوائے گا۔ دو مہینے کے اندر اُن کا بیاہ ہو گیا۔

آرتی کی شادی کے بعد دُرگا نے مندر کے آگے کھڑے ہو کر بھیک مانگنے کا کام چھوڑ دیا۔ پچھلے کئی سالوں سے وہ متواتر آ رہا تھا۔ کوئی عقیدت مند دیر سویر سے آئے وہ ٹھیک وقت پہنچ جاتا تھا۔ جب سیٹھ نرائن داس نے اُسے کئی دن نہیں دیکھا تو اُسے حیرانی ہوئی۔ پہلے تو خیال آیا شاید بیمار نہ پڑ گیا ہو۔ پھر سوچنے لگے کہیں وہ ہمیشہ کے لیے تو نہیں چلا گیا۔ اُس کو ہر روز خیرات دے کر سیٹھ کو بڑی تسکین ملتی تھی خاص طور پر جب درگا اُن کی سلامتی اور صحت کے لیے لمبی دُعا مانگتا تھا۔ سیٹھ اُس کے بارے میں جاننا چاہتا تھا کہ آخر وہ کہاں

گیا۔ مگر نہ تو وہ دُرگا کا نام جانتا تھا اور نہ ہی پتہ۔ وہ اس کو بھول گئے۔ تھوڑے دنوں کے بعد انھوں نے کسی نئے فقیر کو دُرگا کی جگہ دیکھا۔ وہ اُس سے دُرگا کے بارے میں پوچھ سکتا تھا مگر اُس نے مناسب نہیں سمجھا۔ دوسرا شکل سے وہ پاکھنڈی لگتا تھا۔ وہ اس کو خیرات تو دیتا مگر دل سے نہیں اور مقدار میں بھی کم۔ ایک دن سیٹھ کو بھاگل پور سے بیس کلومیٹر دور کسی کام سے ایک گاؤں جانا پڑا۔ وہ بس اڈّے پر گیا۔ اچانک اس کی نظر دُرگا پر پڑی جو ایک طرف کھڑا ہاتھ پھیلا کر بھیک مانگ رہا تھا۔ سیٹھ چپکے سے اس کے قریب گیا اور جا کر کھڑا ہو گیا۔ انھوں نے آہستہ سے کہا:

''دُرگا تُو یہاں؟''

درگا کو آواز جانی پہچانی لگی۔ اُس نے آنکھیں کھول کر جب سیٹھ کو دیکھا تو حیران رہ گیا۔ سیٹھ نے پوچھا ''تو مندر سے کیوں چلا آیا؟''

دُرگا نے جھجکتے ہوئے جواب دیا ''وہ جگہ میں نے اپنی لڑکی کو جہیز میں دے دی ہے۔''

○○

چودھری کا اسکول

کئی سال ہوئے جب ہریانہ ریاست کی پیدائش نہیں ہوئی تھی سونی پت تحصیل میں پہلے ہائی اسکول کی بنیاد رکھنے کے لیے سارے شہر میں منادی والے کی گھنٹی بج گئی۔ شاید اسکول دو چار سال پیشتر کھل جاتا اگر پنجاب سرکار نے جتنی مالی اعانت یعنی گرانٹ کی پیشکش کی وہ کافی ہوتی۔ حقیقت میں اتنی گرانٹ سے تو اسکول کی عمارت بھی کھڑی نہیں ہو سکتی تھی۔ سونی پت کے کچھ ممتاز شہریوں نے چندہ اکٹھا کرنے کی مہم شروع کر دی۔ پھر بھی بات نہیں بنی۔ انھوں نے سوچا کیوں نہ سونی پت کے سب سے بڑے زمیندار تنکا رام سے مشورہ کیا جائے۔ ہو سکتا ہے وہ کچھ سرمایہ اپنے خزانے سے دینے کے لیے راضی ہو جائے۔ پہلے تو چودھری نے صاف انکار کر دیا ''دیکھو بھائی، میں اَن پڑھ آدمی ہوں۔ مجھے ان باتوں کی سمجھ نہیں ہے۔ تھوڑا بہت چندہ دے سکتا ہوں۔ مگر جتنا آپ مانگ رہے ہیں وہ ناممکن ہے۔''

دراصل اپنا رتبہ بلند رکھنے کے لیے چودھری میں خود غرضی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ شاید اُسے دولت کا اتنا لالچ نہیں تھا جتنا اپنے اقتدار کا۔ جب کبھی وہ چندہ دیتا تو اس شرط پر کہ اُس کی شہرت کا ڈھنڈورا سارے شہر میں بجنا چاہیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سونی پت کا ہر شخص اُس کی خود غرضی سے واقف تھا اور جہاں تک اُس کے نام کی بات تھی سونی پت کا بچہ بچہ اُسے جانتا تھا۔ ایک شہری نے کہا ''چودھری صاحب، آپ چندہ دیں گے تو آپ کا نام صرف سونی پت میں ہی نہیں سارے صوبہ میں اخباروں کے ذریعہ مشہور ہو جائے گا۔'' جب ملنے والوں نے اصرار کیا تو چودھری نے صاف صاف کہا ''میری ایک شرط ہے۔

انتظامیہ کمیٹی کا صدر آپ مجھے بنائیں گے اور جب تک میں زندہ ہوں صدر کو نہیں بدلا جائے گا۔"

تھا تو وہ اَن پڑھ مگر زمینوں کی خرید و فروخت کے تجربہ نے اُسے دنیاداری کے داؤ پیچ سکھا دیئے تھے۔ وہ عزّت کا بھوکا تھا۔ جتنی عزّت اُس کو ملتی اس کی طلب اور بڑھ جاتی۔ جب کوئی ضرورت مند اُس کے آگے کھڑا ہو کر درخواست کرتا تھا وہ اندر اندر بہت خوش ہوتا تھا۔ عزّت اُس کی کمزوری تھی۔

تقسیم ہند سے پہلے متحدہ پنجاب میں وزیر اعلیٰ سر سکندر حیات خان کی اتحادی یعنی یونینسٹ پارٹی کی حکومت تھی۔ وزرا میں سر چھوٹو رام وزیر زراعت تھا۔ وہ روہتک کا رہنے والا تھا۔ اُس کو یہ دیکھ کر غم ہوا کہ سارا دن چاہے سردی ہو یا گرمی غریب کسان اور مزدور کھیتوں میں کام کرتے ہیں مگر ساری کی ساری پیداوار زمین دار اُٹھا کر لے جاتے ہیں۔ کسانوں کو اتنی کم اُجرت ملتی ہے کہ دال روٹی اور کچا پیاز کھا کر اُن کا پیٹ نہیں بھرتا۔ اس کے علاوہ چھوٹے چھوٹے کاشت کاروں کی زمین بڑے بڑے زمیندار، قانون گو اور تحصیل دار کو رشوت کھلا کر ہڑپ کر لیتے ہیں۔ غریب کسان پٹواری کو خدا سمجھتے تھے۔ وہ اُن کی روٹی روزی کا واحد مالک تھا۔ چھوٹو رام نے اسمبلی میں ایک بل پیش کیا جس میں یہ تجویز تھی کہ جو زمین کاشت کرے گا زمین اُسی کی ہوگی۔ کیونکہ سارا پنجاب بڑے بڑے زمین داروں سے بھرا ہوا تھا، بل کی سخت مخالفت ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چھوٹو رام کو بل واپس لینا پڑا۔ وہ بل پنجاب میں کالا بل کے نام سے جانا جاتا تھا۔ رہی پٹواری کی اہمیت کی بات تو ایک دفعہ چھوٹو رام کسی گاؤں کے دورہ پر گیا۔ وہاں ایک ضعیف عورت جو لاٹھی کے سہارے چل رہی تھی اُس کو دیکھ کر چھوٹو رام نے اپنی سادگی اور حلیمی دکھانے کے لیے آگے بڑھ کر اُس بوڑھی عورت کے پاؤں چھوئے۔ وہ عورت بڑی خوش ہوئی اور اُس کو دُعا دیتے ہوئے کہا۔ "بھگوان تمھیں اگلے جنم میں پٹواری بنائے تا کہ کم از کم میرے پوتوں کو تو وہ زمین واپس مل جائے گی جو زمین دار نے قرض کی ادائیگی نہ ہونے پر عدالت کا سہارا لے کر اپنے قبضے میں کر لی ہے۔"

چھوٹو رام کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے اُس کی یاد میں سونی پت کے شہریوں اور

اِردگرد کے گاؤں میں رہنے والوں نے اسکول کا نام 'سر چھوٹو رام ہائی اسکول' رکھنے کی مانگ کی۔ ایک شخص نے کہا۔ ''سر کو ہٹا دینا چاہیے کیونکہ یہ انگریزوں کی نشانی ہے۔'' پاس میں کھڑے ایک منچلے نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''سر ہٹا دیا تو دھڑ رہ جائے گا۔ بغیر دماغ کے کام کیسے چلے گا۔''

خیر اسکول کا نام بغیر سر کے رکھا گیا۔ چودھری ٹکارام اب اسکول کے معاملوں میں سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ نہ تو وہ انتظامیہ کمیٹی کی میٹنگ بلاتا تھا اور نہ ہی اسکول کا حساب کتاب دیتا تھا۔ اسکول کی آمدنی جو فیس اور چندہ سے ہوتی تھی وہ چودھری کی تجوری میں چلی جاتی۔ جو رجسٹر اسکول میں رکھے ہوئے تھے وہ دکھاوے کے لیے تھے۔ اصلی حساب کتاب کا علم سوائے چودھری کے اور کسی کو نہیں تھا اور نہ ہی کوئی پوچھنے کی جرأت کرتا تھا۔ سب کو یہ تسلی تھی کہ اسکول چل تو رہا ہے۔

اسکول تو چل پڑا مگر ٹیچر بھنور میں پھنس گئے۔ ایک ٹیچر کی اوسط تنخواہ دو سو پچاس روپے مہینہ تھی جس میں مہنگائی بھتہ بھی شامل تھا۔ مہینہ ختم ہونے کے بعد اُس کو تقریباً ایک سو روپے یہ کہہ کر دیئے جاتے تھے کہ اسکول کے پاس اتنا سرمایہ نہیں ہے کہ پوری تنخواہ دے سکے حالانکہ دستخط پوری تنخواہ کے لیے جاتے تھے۔ اسکول کا ہیڈ ماسٹر بنواری لال سولنکی چودھری کا دُم چھلاّ تھا۔ ایک رسمی خانہ پوری تھی۔ دراصل اُسے اپنی کرسی برقرار رکھنے میں زیادہ دلچسپی تھی۔ وہ وہی کرتا جو چودھری کہتا تھا۔ چودھری رات کو دن کہے وہ بھی دن کہتا تھا۔ چودھری کا پٹھّو ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُسے مہینے کی پوری تنخواہ چپکے سے مل جاتی تھی۔ دوسرے ٹیچر منہ دیکھتے رہ جاتے۔ چودھری کو کوئی فکر نہ تھی اگر کوئی ٹیچر چھوڑ کر چلا جائے۔ وہ چاہتا تھا کہ بے روزگاری کے زمانے میں ایک چھوڑے گا تو دس حاضر ہو جائیں گے۔ جب بھی کوئی ٹیچر چھوڑ کر جاتا اُس کو اپنی واجب الادا بقایا تنخواہ جو کئی مہینوں سے اکٹھی ہو رہی تھی، چھوڑنی پڑتی تھی کیونکہ وہ دستخط پہلے ہی ہر مہینے کر دیتا تھا۔ بدقسمتی سے ٹیچروں میں کوئی اتحاد نہیں تھا۔ اُس کی وجہ یہ تھی کہ کئی ٹیچر ایسے تھے جو پاکستان سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ سونی پت میں اتنے سال گزارنے پر بھی وہ اپنے آپ کو مہاجر اور بے حیثیت سمجھتے تھے۔ جو وہاں

کے رہنے والے تھے اُن میں بہت سے ایسے تھے جن کی آمدنی کا کوئی نہ کوئی دوسرا ذریعہ تھا، وہ پرواہ نہیں کرتے تھے۔ غیر مقامی ٹیچر بہت پریشان تھے خاص طور پر انگریزی کا ٹیچر درشن کمار اور ریاضی کا ٹیچر کشن چند۔ دونوں قابل اور ہوشیار تھے۔ مگر دونوں کی بی اے میں تھرڈ ڈویژن کی وجہ سے کوئی دوسرا اسکول لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ مجبوراً اُنھیں اُسی اسکول میں کام کرنا پڑا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔

پچھلے تین سال سے درشن کمار کی بقایہ تنخواہ تین ہزار روپے سے اُوپر ہوگئی تھی۔ اُس نے کئی بار ہیڈ ماسٹر سے التجا کی مگر اُس کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی تھی۔ ایک دن سولنکی کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ ''ماسٹر جی، آپ تو بہ خوبی جانتے ہیں کہ ٹیچرز کو تنخواہ بانٹنا میرے ہاتھ میں نہیں ہے۔ اگر آپ سے برداشت نہیں ہوتا تو چودھری صاحب سے مل لیجیے۔ مگر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی، باقی استادوں کو تنخواہ کا جتنا حصہ دیا جاتا ہے وہ خوشی سے لے لیتے ہیں۔ ایک آپ ہی ہیں جو ہمیشہ احتجاج کرتے ہیں۔'' جب درشن کمار کچھ بولنے لگا تو بنواری لال نے تناؤ میں کہا ''مجھے بار بار کہنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ آپ کو جو کچھ کہنا ہے چودھری صاحب سے کہیے۔'' درشن کمار کو آگاہ کرتے ہوئے بنواری لال نے پھر کرخت لہجے میں کہا۔ ''آئندہ تنخواہ کے لیے آپ میرے پاس مت آیا کریئے۔ آپ خواہ مخواہ میرا وقت ضائع کرتے ہیں۔''

چودھری ٹکارام اسکول کی عمارت سے کوئی سو گز کی دُوری پر ایک ہزار ایک سو گز کے اندر بنی کوٹھی میں اپنے خاندان کے پندرہ افراد کے ساتھ رہتا تھا۔ پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی بلکہ بہتات تھی۔ مگر چودھری کے رہنے سہنے کا ڈھنگ فرسودہ طرز کا تھا۔ ایک دھوتی اور لمبا سا چولا جسم کو ڈھکنے کے لیے کافی تھا جو ہفتے میں وہ ایک بار بدلتا تھا۔ پگڑی دھونے کی باری مہینے میں ایک بار اور بدلنے کی سال میں ایک بار آتی تھی۔ چودھری کے لڑکے کچھ کہتے تو وہ اُن کی سُنی اَن سُنی کر دیتا۔ بینائی کم ہو جانے کی وجہ سے وہ دو چشموں کا استعمال کرتا تھا۔ ایک دور کے لیے دوسرا نزدیک کے لیے۔ پچھلے دو سال سے آنکھوں کا معائنہ نہیں کروایا تھا۔ اُسے ڈرتا تھا اگر نمبر بدل گیا ہے تو چشمہ بھی بدلنا پڑے گا۔ خواہ مخواہ کا خرچہ تھا۔ جب بھی وہ

گھر سے باہر جاتا اُس کا خاص ملازم اُس کے ساتھ رہتا۔ کوٹھی تو بڑی تھی مگر ایسا لگتا تھا کئی سالوں سے نہ تو اُس کی خاص مرمّت کرائی گئی تھی اور نہ ہی دیواروں پر سفیدی۔

درشن کمار چودھری صاحب کو ملنے گیا تو نوکر نے جواب دیا۔ ''چودھری صاحب گھر پر نہیں ہیں۔ کسی کام سے روہتک گئے ہوئے ہیں۔'' جب درشن کمار نے پوچھا۔ ''کتب تک لوٹ آئیں گے۔'' تو نوکر نے جواب دیا ''شام سے پہلے لوٹنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ آپ کل آ جایئے۔'' درشن کمار اپنا سامنہ لے کر واپس آ گیا۔

اگلے دن اسکول بند ہونے کے فوراً بعد وہ سیدھا چودھری صاحب کے گھر گیا۔ اتفاق سے وہ گھر پر ہی تھا۔ نوکر درشن کمار کو اندر لے گیا۔ چودھری ایک کرسی پر بیٹھا کھاتے میں کچھ لکھ رہا تھا۔ اُس کا چشمہ نیچے سرک کر ناک کی پُل پر آ کر رُک گیا تھا۔ چشمے کو ٹھیک کرتے ہوئے چودھری نے پوچھا ''کون ہے بھائی؟''

درشن نے جواب دیا۔ ''چودھری صاحب میں درشن کمار ہوں؟'' اُس نے جواب دیا ''چودھری صاحب مَیں آپ کے اسکول میں انگریزی پڑھاتا ہوں۔''

''اچھا اچھا'' چودھری نے اس انداز سے کہا جیسے اُسے اچانک درشن کمار کا نام یاد آ گیا ہو۔ ''یہاں کیسے آنا ہوا؟ کوئی خاص کام ہے ہم سے؟''

''چودھری صاحب پچھلے دو مہینے سے تنخواہ نہیں ملی اور ویسے بھی ہر مہینے آدھی تنخواہ ملتی ہے۔'' درشن نے بے مزگی سے جواب دیا۔

''تو میں کیا کروں؟ میں تنخواہ تھوڑے بانٹتا ہوں۔ آپ ہیڈ ماسٹر سے کہو۔'' چودھری نے تنک مزاجی سے جواب دیا۔

''چودھری صاحب میں ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس گیا تھا۔ انھوں نے آپ کا نام لے کر کہا اُن سے ملو۔''

چودھری کو اندر اندر تھوڑا غصہ آ رہا تھا جسے اُس نے حقّے کے کش کی طرح ہوا میں اُڑا دیا۔ اُس نے حلیمی سے جواب دیا۔ ''ماسٹر جی، میں گھر میں اتنی رقم نہیں رکھتا۔ اب بینک بند ہو گیا ہوگا۔ آپ کل آ جانا آپ کو چیک دے دوں گا۔'' کیونکہ چودھری نے درشن کمار سے

یہ نہیں پوچھا کہ اُس کی کتنی رقم بقایہ تھی درشن کمار سمجھ گیا کہ چودھری نے اُسے ٹرخایا ہے مگر وہ کیا کر سکتا تھا۔ سر نیچا کر کے وہ چلا گیا۔

درشن کمار نے جب یہ قصہ کشن چند کو سنایا تو وہ ہنس کر کہنے لگا ''میاں، ان تلوں سے اتنی آسانی سے تیل نہیں نکلنے والا۔ چودھری جتنا اُوپر ہے اُتنا زمین کے اندر ہے۔ پیسے کے معاملے میں خرانٹ ہے۔ بنئے سے بھی بدتر ہے۔''

''یار، قسمت کہاں لے آئی؟ بُری طرح سے پھنس گئے ہیں۔'' درشن نے اُداسی سے کہا۔

''کیوں فکر کرتے ہو؟ کسی نہ کسی دن یہاں سے چھٹکارا مل ہی جائے گا۔'' کشن چند نے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

''تنخواہ کی بات تو ایک طرف رہی، یہاں پڑھانے میں بھی کوئی مزہ نہیں ہے۔ زیادہ تر لڑکوں کو تو پڑھائی میں کوئی دلچسپی ہی نہیں۔ کبھی کبھی ایسا لگتا ہے بھینس کے آگے بین بجا رہا ہوں۔ میں نے ایک دفعہ ایک لڑکے سے پوچھا اگر تمھارا پڑھنے میں دل نہیں لگتا تو اسکول کس لیے آتے ہو؟''

لڑکے نے سیدھے صاف جواب دیا۔ ''میں تو نہیں آنا چاہتا۔ میرا باپو مجھے مجبور کرتا ہے۔ کہتا ہے میٹرک کرے گا تو کسی اچھے گھر کی لڑکی مل جائے گی۔ نہیں تو کسی ٹٹ پونجیا کی بیٹی سے شادی کرنی پڑے گی۔''

کشن چند کا تجربہ کچھ مختلف نہیں تھا۔ اُس نے بھی ایک بات سنائی جو کسی چٹکلے سے کم نہیں تھی۔ ''ایک دن جب کلاس ختم ہوئی ایک لڑکا مجھ سے آ کر کہنے لگا۔ ماسٹر جی، ہماری حاضری لگا دیونا۔ میں دنگل دیکھنے گیو تھا۔'' جب میں نے کہا ''حاضری کلاس میں بیٹھنے سے لگتی ہے۔ آوارہ گردی کرنے سے نہیں۔ وہ بولا ''ماسٹر جی، آپ کا کے جاوئے، لگا دونا۔''

''ایسے ہی تمھیں ایک اور لڑکے کی مزیدار بات سناتا ہوں۔ اسکول کے سہ ماہی امتحان ختم ہونے کے کچھ دن بعد ایک لڑکا میرے گھر آ گیا۔ اور پوچھنے لگا۔ ماسٹر جی، میں پاس تو ہو جاؤں گا نا؟''

''میں نے جواب دیا اگر تم نے ٹھیک جواب دیئے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ پاس نہ ہو۔''

''وہ مجھے کہتا ہے۔ ماسٹر جی، مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ ہمارا خیال رکھنا۔ گرمی کی چھٹیاں ختم ہونے پر آپ کے لیے گاؤں سے خالص گھی، گڑ اور تازہ گنّے لاؤں گا۔ میں نے اُسے بھگا دیا۔ رشوت کا لالچ دے رہا تھا۔''

اگلے دن ٹھیک دس بجے درشن کمار چودھری کے گھر پہنچ گیا معلوم ہوا چودھری حصار گیا ہوا ہے۔ دو دن بعد لوٹے گا۔ درشن کمار ایک بار پھر اپنا سا منہ لے کر آ گیا۔ اُس نے خود سے کہا ''اگر مجھے سو چکّر بھی لگانے پڑیں تو میں چودھری کو چھوڑوں گا نہیں۔ کب تک ٹالے گا۔'' دو دن گزرنے پر وہ پھر گیا۔ اتفاق سے چودھری گھر پر تھا۔ جب وہ اندر گیا تو اُس نے کہا ''چودھری صاحب، رام رام'' چودھری نے پڑھنے والی عینک ہٹا کر دُور دیکھنے والی عینک لگائی اور پوچھا ''کون ہے بھائی؟''

''میں درشن کمار ہوں۔ آپ کے پاس تنخواہ کے سلسلے میں آیا تھا۔ آپ نے مجھے کہا تھا کہ میں ہیڈ ماسٹر صاحب سے جا کر ملوں۔ انھوں نے مجھے صاف الفاظ میں کہا ''مجھے تنخواہ دینے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ میں واپس آ گیا۔'' درشن نے ترشی سے جواب دیا۔

چودھری نے سکھبیر سنگھ خزانچی کو بلایا اور پوچھا ''آج کچھ فیس اکٹھی ہوئی کیا؟''

خزانچی نے سرسری طور پر جواب دیا ''آج کوئی لڑکا فیس جمع کروانے نہیں آیا''

چودھری نے سکھبیر سنگھ کو اشارہ کیا کہ وہ جا سکتا ہے۔ پھر درشن کمار سے کہا ''ماسٹر جی، میں آپ کی مشکل کو سمجھتا ہوں۔ مگر میں بھی کچھ حد تک مجبور ہوں۔ اسکول کی مالی حالت اچھی نہیں ہے۔ پھر بھی آپ کی مدد کرنا میرا فرض ہے۔ میں آپ کو دو سو روپے کا چیک دے دیتا ہوں۔ آپ کل بینک جا کر تڑوا لینا'' درشن نے گھبراتے ہوئے پوچھا ''مجھے مایوس تو نہیں لوٹنا پڑے گا۔''

چودھری نے جواب دیا ''یہ چیک میں آپ کو اپنے نجی اکاؤنٹ سے دے رہا ہوں۔ اسکول سے حساب کر لوں گا۔ ابھی آپ اپنا کام چلائیے۔'' درشن نے چودھری کا شکریہ ادا کیا اور چلا گیا۔

گھر جاتے ہوئے راستے میں وہ سوچنے لگا کہیں چودھری نے پہلے کی طرح اُسے ٹال تو نہیں دیا ہے۔ رات کو اسے نیند نہیں آئی۔ ساری رات اسی فکر میں کٹ گئی کہ چیک ٹوٹے گا یا نہیں۔"

اگلے دن ٹھیک دس بجے وہ بینک پہنچ گیا۔ ابھی بینک کے دروازے عام لوگوں کے لیے نہیں کھلے تھے اور پورا عملہ بھی نہیں آیا تھا۔ کارکن خراماں خراماں آتے اور دس بج کر بیس منٹ سے پہلے کوئی بھی اپنی سیٹ پر اپنا وزن نہیں ڈالتا تھا۔ جب کھڑکی کھلی تو پہلا چیک درشن کمار کا تھا۔ کلرک نے وہ چیک پیچھے اِکاؤنٹ کو پکڑایا۔ اُس نے چودھری کا کھاتا دیکھ کر چیک کلرک کو یہ کہہ کر لوٹا دیا۔ "کھاتے میں صرف تیرہ روپے ہیں۔"

درشن کمار کو بہت غصہ آیا۔ اگر اُس وقت چودھری سامنے کھڑا ہوتا تو شاید یا تو وہ اُسے سو سو گالیاں سناتا یا لوگوں کے سامنے اُس کی بے عزّتی کرتا۔ بینک سے سیدھا وہ چودھری کی کوٹھی پر گیا۔ اُس نے ارادہ کرلیا تھا کہ اس بار وہ چودھری کو کھری کھری سنائے گا، مگر وہ گھبرا رہا تھا کہ چودھری کہیں سونی پت سے باہر نہ چلا گیا ہو۔ اتفاق سے وہ گھر پر تھا۔ وہ سیدھا اندر چلا گیا۔ چودھری کرسی پر بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ چودھری کو کچھ کہتا اُس کی عقل نے کہا۔ "تحمل سے کام لو۔ اگر نوکری سے نکال دیئے گئے تو کیا کرو گے۔" اُس نے چودھری سے غصّے میں تو نہیں مگر ہیجان کے ساتھ کہا "چودھری صاحب آپ نے مجھے دو سو روپے کا چیک دیا تھا۔ اُسے توڑانے کے لیے صبح میں بینک گیا۔ مجھے یہ سن کر حیرت ہوئی کہ آپ کے کھاتے میں صرف تیرہ روپے ہیں۔"

چودھری نے اُس کی بات کو کاٹتے ہوئے کہا۔ "ماسٹر جی چیک آپ کو کیش کرانے کے لیے نہیں دیا تھا۔ وہ تو آپ کی تسلّی کے لیے تھا کہیں آپ یہ نہ سمجھیں کہ اسکول آپ کا پیسہ کھا گیا۔"

OO

خادمہ

جب صبح کوئی سات بجے سُولکشنا پردیسی دروازہ کھول کر اخبار اُٹھانے لگی تو اُس کے اندر رکھے ہوئے اشتہاروں میں ایک نیچے گر پڑا۔ ویسے تو وہ بی.اے. پاس تھی مگر اخبار سرسری طور پر پڑھتی تھی۔ پہلے تو اُس نے گرے ہوئے اشتہار کو رڈی کا کاغذ سمجھ کر نظرانداز کر دیا۔ پھر نہ جانے کیا خیال آیا کہ اُسے اُٹھا کر دیکھنے لگی۔ وہ کسی ملک ایجنسی کا اشتہار تھا جس میں لکھا تھا اگر آپ کو کوئی نوکر، نوکرانی، ڈرائیور، دایہ، باورچی، مالشی یا گھریلو مدد کی ضرورت ہو تو ہم سے رابطہ قائم کیجیے۔ اشتہار کو پڑھ کر اُس کی باچھیں کھل اُٹھیں جیسے اشتہار کی جگہ واقعی کوئی خادمہ آ گئی ہو۔ پُرانی میڈ دس دن کی چھٹی لے کر گئی تھی۔ بیس دن ہو گئے تھے، اُس کا کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ سُولکشنا کے لیے تو مانو مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اُس نے ایک جز وقتی نوکرانی جھاڑو لگانے، برتن صاف کرنے اور جھاڑ پونچھا کے لیے رکھ لی تھی۔ گھر کے کئی اور کام تھے جو سُولکشنا کو خود کرنے پڑتے تھے۔ خاص طور پر کھانا بنانے میں اُسے بڑی کوفت ہوتی تھی۔ ہڑبڑاہٹ میں کچھ نہ کچھ جلا دیتی تھی۔ سبزی میں کبھی نمک کم تو کبھی زیادہ۔ اچھی بھلی تھی، تندرست تھی، مگر گھر کے کام کو دیکھ کر اُسے ایک دو دن بخار بھی چڑھ گیا۔ نئی خادمہ کے لیے کئی جگہ کوشش کی۔ اڑوس پڑوس میں کہا۔ اپنی ماں کو فون کیا۔ دو چار سہیلیوں کو بھی بتایا، مگر کوئی کام کی خادمہ نہیں ملی۔ اشتہار کا مضمون پڑھتے ہی وہ سیدھی خواب گاہ میں گئی جہاں اُس کا شوہر امرت پردیسی ابھی تک سو رہا تھا۔ سُولکشنا نے اُسے ہلاتے ہوئے نیند سے جگانے کی کوشش کی۔ آدھی آنکھیں کھول کر اُس نے پوچھا ”کیا بات ہے؟ بڑی مشتعل لگ رہی

ہو۔" جب سُولکشنا نے وہ اشتہار دکھایا تو اُس نے پڑھ کر کہا" اچھا، میں سمجھ گیا۔ تم فکر مت کرو۔ میں آج ہی پتہ لگا تا ہوں۔"

دفتر سے آدھے دن کی چھٹی لے کر پردیسی ملِک ایجنسی کے دفتر پہنچ گیا۔ وہاں پہلے ہی دو مؤکل بیٹھے تھے۔ اُن سے نپٹ کر ملِک نے اپنی توجہ پردیسی کی طرف پھیری اور کہا" تو آپ کو میڈ چاہیے؟"

پردیسی کو حیرانی ہوئی۔ اُس نے کہا" پوچھے بغیر آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں میڈ کے لیے آیا ہوں۔"

ملِک نے فخر کے ساتھ جواب دیا۔" پندرہ سال ہو گئے ہیں اس کام کو کرتے ہوئے۔ ہم تو مؤکل کی شکل دیکھ کر جان لیتے ہیں۔"

پردیسی نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ ملِک نے کہا" معاف کیجیے۔ میں نے آپ کا اسم شریف نہیں پوچھا۔ بندہ کو لوگ مختصر طور پر ملِک کہتے ہیں۔"

پردیسی نے جب اپنا نام بتایا تو ملِک نے پوچھا" آپ کسی بیرونی ملک سے آئے ہیں؟"

پردیسی نے ہنستے ہوئے کہا۔" نہیں تو، پردیسی میری ذات ہے۔"

ملِک نے دو صفحے کا ایک فارم پردیسی کو دیا اور کہا" آپ اسے بھر دیجیے۔"

دفتر میں رکھی ایک خالی میز کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا" آپ وہاں آرام سے بیٹھئے، جب تک آپ فارم بھریں گے میں دوسرے مؤکلوں سے نپٹ لوں گا جو کمرے کے باہر بیٹھے ہیں۔"

ملِک نے جب وہ فارم دیکھا تو گھبرا گیا۔ نہ جانے اُس میں کس کس طرح کے کئی اُوٹ پٹانگ سوال تھے۔ جیسے آپ کو میڈ گورے رنگ کی چاہیے یا کالی؟ پڑھی لکھی ہو یا اَن پڑھ، بنگلا دیشی ہو یا بہاری؟ کیا آپ میڈ کو وہی کھانا دیں گے جو آپ خود کھاتے ہیں؟ وہ کہاں سوئے گی؟ کوئی علیحدہ کمرہ ہے یا چٹائی بچھا کر باورچی خانے میں سوئے گی۔ میڈ تین سے چار بجے تک آرام کرے گی۔ اس ایک گھنٹے میں آپ اُسے کوئی کام نہیں بتائیں گے

چاہے آپ کے گھر میں مہمان کیوں نہ بیٹھے ہوں۔کھانے کے علاوہ آپ اُسے صابن، تیل، تولیہ، ٹوتھ پیسٹ وغیرہ دیں گے۔اگر وہ کبھی آپ کا غسل خانہ استعمال کرے تو آپ اُسے ڈانٹیں گے نہیں۔اگر وہ آپ کی کنگھی یا پرفیوم استعمال کرے تو آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔اگر اُس کا کوئی ملنے والا آ جائے تو وہ آپ کی نشست گاہ میں اُسے بٹھا سکتی ہے۔ اُس کو ٹی.وی دیکھنے کا پورا حق ہوگا۔اگر چہ اُس کے پاس اپنا موبائل ہے مگر گاہے بگاہے آپ کا فون استعمال کر سکتی ہے۔اگر کھانے میں نمک اور مرچ کم یا زیادہ پڑ جائے یا کوئی گلاس یا پلیٹ ٹوٹ جائے آپ اُس کو بُرا بھلا نہیں کہیں گے۔

فارم کو غور سے پڑھنے کے بعد پردیسی صوفہ سے اُٹھ کر آیا اور ملِک کی میز کے آگے رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ملِک نے پوچھا ''آپ نے پڑھ لیا؟''

پردیسی نے جواب دیا ''پڑھ تو لیا۔لیکن کئی شرطیں کڑی ہیں۔''

ملِک نے جواب دیا ''بابو جی آجکل کی میڈ بھی کڑی ہیں ہم کیا کریں۔ہم تو گاہک کو وہی مال دیں گے جو پیچھے سے آتا ہے۔''

پردیسی اصلی مدعے پر آیا اور پوچھنے لگا ''آپ کی شرطیں کیا ہیں؟''

مَلِک نے سیدھا جواب دیا ''میڈ پانچ ہزار روپے مہینہ لے گی؟ کھانا پینا رہنا سب آپ کے ذمّے۔ ہماری فیس دس ہزار روپے یک مشت ہے۔اگر کوئی میڈ کسی وجہ سے آپ کو پسند نہیں آتی تو ہم بدل دیں گے۔اگر دوسری بھی آپ کے معیار کے مطابق پوری نہیں اُترتی ہم اُسے بھی بدل دیں گے۔اس کے بعد تیسری یعنی آخری......''

''میڈ کب تک مل جائے گی؟'' پردیسی نے پوچھا۔

''اس وقت میرے پاس ایک میڈ ہے۔کہیے تو کل اُسے آپ کے گھر لے آؤں۔''

''شادی شدہ ہے یا کنواری؟''

''فی الحال تو کنواری ہے۔''

''کیا عمر ہے؟''

''بائیس سال کے قریب۔'' ملک نے جواب دیا۔

''کس صوبہ کی ہے؟''

''بہاری ہے۔'' مِلک نے بتایا۔

''میں گھر جا کر بیوی سے بات کرتا ہوں۔ شام کو فون کر دوں گا۔ نوے فیصدی تو ہم اُسے رکھ لیں گے مگر بیوی کی صلاح کے بغیر میں اُسے نہیں رکھ سکتا۔'' شام کو اُس نے پردیسی کو فون کیا کہ کل وہ لڑکی کو لے کر گھر آ جائے۔

اتفاق سے اگلا دن اتوار تھا۔ پردیسی گھر پر تھا۔ وعدہ کے مطابق مِلک منجولا نام کی ایک میڈ کو لے کر ٹھیک دس بجے پردیسی کے گھر پہنچ گیا۔ میڈ نے صاف ستھرے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اُس نے ہاتھ جوڑ کر ادب کے ساتھ نمستے کی۔ پردیسی نے بغیر خاص پوچھ تاچھ کے اُسے رکھ لیا۔ منجولا کو پردیسی کے سپرد کر کے اپنی کمیشن نقدی میں لے کر وہاں سے چلا آیا۔ منجولا کے ہاتھ میں ایک بڑا سا تھیلا تھا جس میں اُس کے کپڑے وغیرہ تھے۔ سُولکشنا نے ایک گھنٹہ لگا کر اُسے گھر کا کام سمجھا دیا۔ اتنے میں بارہ بج گئے۔ وہ اُسے رسوئی گھر میں لے گئی۔ اُسے گوبھی کاٹنے کے لیے دی۔ جب منجولا سبزی کاٹ رہی تھی اُس کی انگلی چھری سے کٹ گئی۔ خون بہنے لگا۔ وہ چلاّنے لگی۔ پردیسی بھاگ کر آیا۔ اُس کے زخم پر ڈیٹول لگایا اور پٹی باندھ دی۔ منجولا نے دو دن تک کھانا نہیں بنایا۔ وہ بہت سے کام غلط کرتی تھی جیسے ناتجربہ کار ہو۔ حالانکہ مِلک نے بتایا تھا کہ اُسے پانچ سال کا تجربہ ہے۔ ہر طرح کا کھانا بنا لیتی ہے۔ سُولکشنا پریشان تھی کہ اُسے کیسی بے ہودہ میڈ ملی۔ اُس نے منجولا کو جب کئی بار ڈانٹا تو ایک دن وہ بول پڑی ''بی بی جی۔ آپ ڈانٹتی بہت ہیں۔ آخر مَیں بھی انسان ہوں۔ تھوڑی بہت غلطی تو ہو ہی جاتی ہے۔ میں جان کر تو نہیں کرتی۔ اگر آپ مجھے ایسے روز روز ڈانٹیں گی تو میں چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔'' دراصل مِلک نے منجولا اور ایسی ہی دو لڑکیوں کو اس طرح کی ٹریننگ دے رکھی تھی کہ وہ کوئی نہ کوئی ایسا کام کریں جس سے مالک تنگ آ کر اُنھیں واپس بھیج دے۔ سُولکشنا کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ نوکرانی تھی اور منجولا اُس کی مالکن۔ تنگ آ کر پردیسی نے مِلک کو فون کیا۔ بغیر کوئی سوال کیے مِلک نے کہا۔ ''اگر وہ آپ کو پسند نہیں ہے تو کوئی بات نہیں کل میں آپ کے ملازم کے ہاتھ دوسری میڈ کو بھجوا دوں گا۔ آپ

بے فکر رہیے۔"

منجولا چلی گئی۔ اُس کی جگہ تلسی آ گئی۔ وہ بنگلا دیشی تھی۔ اُس کا اصلی نام نُورن تھا۔ غیر قانونی طور پر ہندوستان میں گھس آنے کے بعد اُس نے اپنا نام بدل کر تلسی رکھ لیا۔ وہ شادی شدہ تھی۔ دو بچّے تھے۔ اُس کا خاوند کسی دفتر میں چپراسی کا کام کرتا تھا۔ ہندوستان آئے ہوئے اُسے دو سال ہو گئے تھے۔ جھاڑو لگانا، برتن صاف کرنا اور دوسرے گھر کے کام تو وہ جانتی تھی، مگر کھانا بنانے میں ناتجربہ کار تھی۔ چاہے مِلک نے وثوق سے کہا تھا کہ وہ کھانا بنانا جانتی ہے۔ البتہ اُس نے ایک جملہ ضرور لگایا تھا کہ اگر آپ کو اپنی پسند کا کھانا چاہیے تو اُسے تھوڑا بہت سکھانا پڑے گا۔ اس کے علاوہ اُس کی ہندی وہی سمجھ سکتی تھی۔ سُولکشنا کو ہر بات سمجھانے کے لیے دوبارا اپنی زبان کا استعمال کرنا پڑتا تھا مگر تلسی کی بات سُولکشنا کی سمجھ میں آدھی آتی تھی آدھی نہیں آتی تھی۔ کام چلانے کے لیے وہ زبان کے ساتھ اشاروں سے بھی کام چلاتے تھے۔ تیسرے دن وہ بیمار پڑ گئی۔ اُس کے پیٹ میں زور کا درد ہوا جو پردیسی سے سنبھالا نہیں گیا۔ اُس نے مِلک کو فون کیا "اب میں کیا کروں۔ وہ آتے ہی بیمار پڑ گئی ہے۔ ہم اپنی دیکھ بھال کریں یا اُس کی۔ اس کے علاوہ اُس کی بولی سمجھنے کے لیے کسی ترجمان کو رکھنا پڑے گا۔ کوئی اور بندوبست کرنا پڑے گا۔"

مِلک نے جواب دیا "ٹھیک ہے کل کسی اور کو بھیج دوں گا۔ مگر یاد رہے یہ آخری موقع ہوگا۔"

اگلے دن تیسری میڈ سورن نے کام شروع کر دیا۔ وزن زیادہ ہونے کی وجہ سے کام کافی آہستہ کرتی تھی۔ صفائی کرنے، جھاڑو پونچھا لگانے، برتن صاف کرنے اور غسل خانے صاف کرتے کرتے وہ گیارہ بجا دیتی تھی۔ ایک گھنٹہ کپڑے دھونے اور نہانے میں لگاتی تھی۔ مگر پریشانی کی بات یہ تھی کہ دن میں دو تین گھنٹے وہ موبائل پر لگی رہتی۔ ایک ہاتھ سے چائے دانی میں پانی ڈالتی تو دوسرے ہاتھ میں موبائل پکڑا ہوا ہوتا تھا۔ ایسا ہی وہ کھانا بناتے وقت کرتی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا وہ پورا دھیان نہیں دیتی تھی۔ کبھی نمک زیادہ تو کبھی کم۔ کبھی روٹی آدھی کچی تو کبھی سڑی ہوئی۔ سُولکشنا نے اُسے بہت سمجھایا کہ کھانا بناتے وقت تو موبائل

کا استعمال مت کرو۔ مگر وہ سُنی اَن سُنی کر دیتی تھی۔ کھاتی بہت تھی۔ جتنا کھانا دونوں پردیسی مل کر کھاتے تھے وہ اکیلی کھا جاتی تھی۔ سات دن گزرنے پر ایک عجیب بات ہوئی۔ امرت اور سُولکشنا گھر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ اُن کی غیر موجودگی میں سورن اپنے کپڑے وغیرہ تھیلے میں ڈال کر بھاگ گئی۔ جب وہ گھر واپس آئے تو انھوں نے دیکھا کہ سورن گھر میں نہیں ہے۔ امرت نے اُسے موبائل کیا۔ فون کسی آدمی نے اُٹھایا۔ پردیسی نے کہا ''سورن سے بات کرنی ہے۔''

اس شخص نے جواب دیا ''یہ سورن کا نمبر نہیں ہے۔'' پردیسی نے دوبارہ چیک کیا۔ نمبر صحیح تھا۔ اس نے ایک بار پھر فون کیا۔ اُسی آدمی نے اُٹھایا اور وہی جواب دیا۔

رات ہو چکی تھی۔ صبح دس بجے پردیسی نے ملِک کو فون کر کے سارا ماجرا سنایا۔ ملِک نے بے رُخی سے جواب دیا۔ ''آ جائے گی۔ کہیں اِدھر اُدھر گئی ہوگی یا اپنی سہیلی کو ملنے گئی ہوگی۔'' جب ملِک نے بتایا کہ وہ اپنا سامان ساتھ لے گئی ہے تو ملک نے جواب دیا ''گھبرایئے نہیں میں ابھی پتہ لگاتا ہوں۔''

پردیسی نے کہا ''ہم میڈ کے بغیر کیا کریں؟''

ملک نے لاپرواہی سے جواب دیا۔ ''پہلے والا اقرارنامہ ختم ہو گیا ہے۔ اگر آپ کو میڈ چاہیے تو نیا اقرارنامہ کرنا ہوگا۔''

پردیسی مایوس ہو کر گھر آیا۔ اتفاق سے اُس کا چچیرا بھائی رمن آیا ہوا تھا۔ اُس نے پردیسی کو مغموم حالت میں دیکھ کر پوچھا ''بھائی صاحب خیریت تو ہے۔ آپ کچھ تناؤ میں لگتے ہیں۔''

پردیسی نے جب اُسے ساری کہانی سنائی تو رتن نے زور دیتے ہوئے کہا ''آپ کا پالا کسی سُوّر سے پڑ گیا ہے۔ وہ بڑا کائیاں آدمی ہے۔ اُس نے چار پانچ لڑکیاں رکھی ہوئی ہیں، جن کو اُس نے اس طرح کی ٹریننگ دے رکھی ہے کہ وہ کوئی نہ کوئی کرتوت ایسی کریں گی کہ مالک مجبور ہو کر اُسے بدلنے کے لیے کہے گا۔ اپنی کمیشن تو وہ پہلے ہی لے لیتا ہے۔''

''تم یہ سب کیسے جانتے ہو؟'' پردیسی نے پوچھا۔

''میرا ڈرائیور اُس کے ہاں دو سال کام کر چکا ہے۔ وہ اُس کی رگ رگ سے واقف ہے۔ اُس کا کئی مؤکلوں سے جھگڑا ہو چکا ہے۔ گالیاں کھا کر بھی وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتا۔''

پردیسی نے دل میں سوچا خادمہ ملے نہ ملے ایک بار تو ملِک کو کھری کھری سنانی چاہیے۔ اگلے دن وہ اُس کے دفتر پہنچ گیا۔ اتفاق سے منجولا اور سورن اُس کے دفتر میں کھڑی تھیں۔ پردیسی کو دیکھتے ہی وہ پیچھے والے کمرے میں چلی گئیں۔ پردیسی نے ملِک سے کہا ''آپ تو کہہ رہے تھے کہ سورن کا ابھی تک پتہ نہیں لگا مگر میں نے تو اُسے ابھی ابھی منجولا کے ساتھ پیچھے کی طرف جاتے ہوئے دیکھا ہے۔''

''پردیسی صاحب۔ آپ کو پہچاننے میں غلطی ہوئی ہے۔ سب میڈ ایک جیسی لگتی ہیں۔'' ملک نے بے دریغ جواب دیا۔

پردیسی کو غصہ آ گیا۔ اُس نے بے محابا کہا ''اب آپ کا کیا ارادہ ہے۔ پولیس میں رپورٹ کروں یا عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاؤں۔''

ملِک ایسی کئی دھمکیاں سن چکا تھا۔ ملِک پر دھونس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے اعتماد کے ساتھ ترش زباں میں کہا ''آپ کی مرضی۔ میں نے اقرار نامہ کے تحت آپ کو تین میڈ دی تھیں مگر آپ کو ایک بھی پسند نہیں آئی۔ میں کیا کروں؟''

پردیسی نے ملِک پر تہمت لگاتے ہوئے کہا ''میں نے سنا ہے آپ نے تین چار لڑکیاں رکھی ہوئی ہیں جن کو آپ نے یہ ٹریننگ دے رکھی ہے کہ وہ کوئی نہ کوئی ایسی نامعقول بات کریں یا بدتمیزی سے پیش آئیں کہ مالک مجبور ہو کر اُن کی چھٹی کر دے۔''

''پردیسی صاحب لگتا ہے کسی نے میرے خلاف آپ کے کان بھرے ہیں۔ پندرہ سال سے یہ دھندا چلا رہا ہوں۔ ایسے کرخت الفاظ میں نے پہلے کبھی نہیں سنے۔ خیر جانے دیجیے۔'' ملک نے بڑی صفائی سے اپنی غلطی کو چھپاتے ہوئے کہا۔

پردیسی نے مجبور ہو کر پوچھا ''تو اب میں کیا کروں؟''

ملِک نے ایک گھڑا گڑھایا جواب دیا۔ ''پردیسی صاحب آپ شریف آدمی ہیں۔

ایک بات بتاؤں۔ زمانہ بدل گیا ہے۔ گھر پر کام کرنے والی نوکرانیوں کی مانگ بڑھ گئی ہے۔ وہ اپنی اہمیت کو سمجھتی ہیں۔ بہت نخرے کرتی ہیں۔ جو عام طور پر مالک پسند نہیں آتے۔"

پردیسی چپ بیٹھا ملک کی بات سن رہا تھا۔ اُس نے کہا "خیر کوئی بات نہیں۔ آپ ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔ مگر آپ نے یہ نہیں بتایا کہ اب میں کیا کروں۔ میں بار بار تو اقرار نامہ نہیں کر سکتا۔ دس ہزار روپے کوئی معمولی بات نہیں ہے۔"

ملک نے آخری پینترا اپنے پرانے ترکش سے چھوڑا "آپ کو ایک صلاح دوں۔"

پردیسی نے بے تابی سے پوچھا "بتایئے۔"

ملک نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "آپ اپنے نوکر خود بنئے۔"

OO